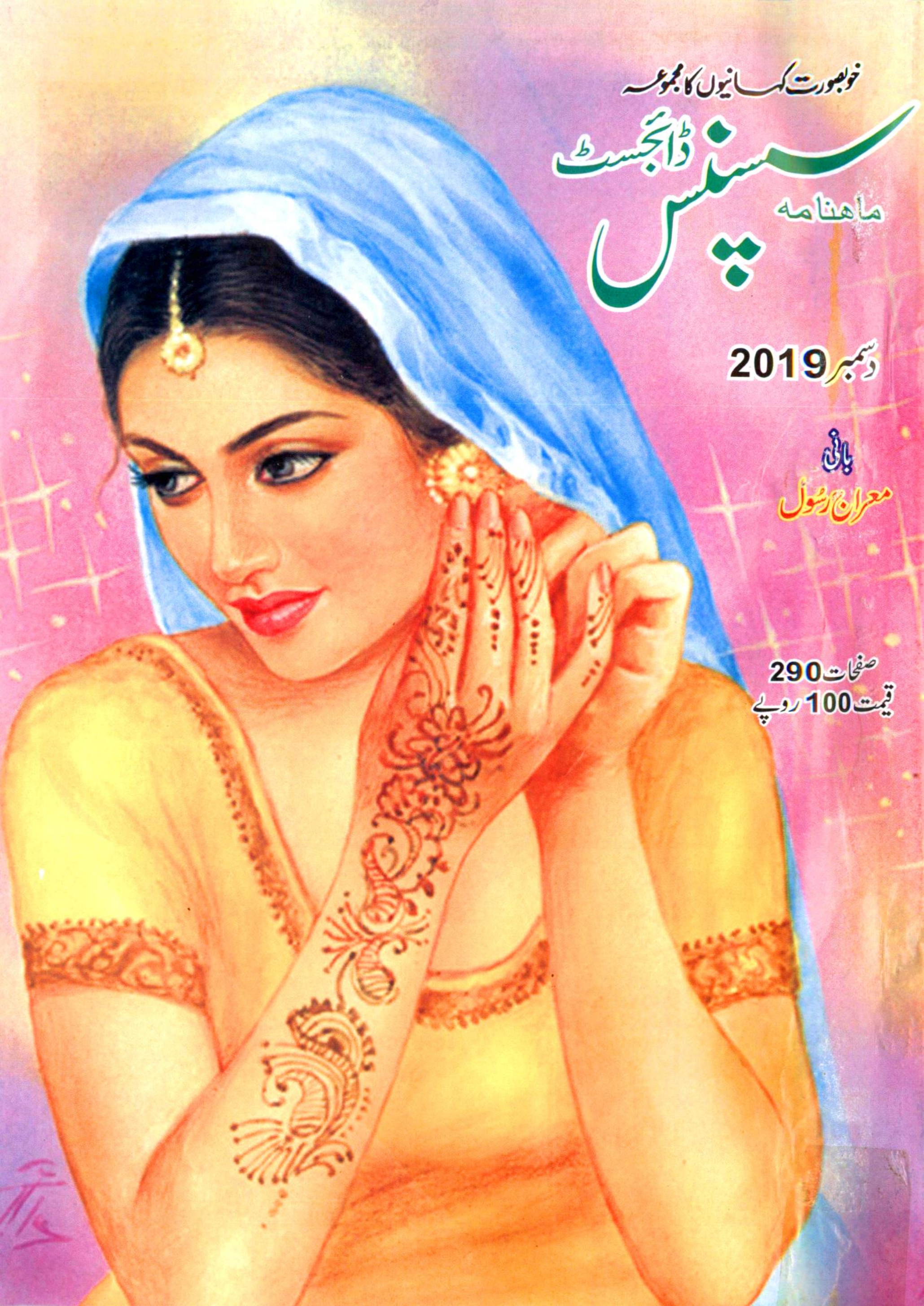

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ

سسپنس ڈائجسٹ

دسمبر 2019

بانی

معراج رسول

صفحات 290

قیمت 100 روپے

سسپنس ڈائجسٹ
CPNE
MEMBER APNS

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ یمنیٰ احمد
نائب مدیر اطہر حسین

مینجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن مینجر
سید منیر حسین
0333-3285269

07 انشائیہ — جون ایلیا
قانون سازی اور قانون کی پابندی پر ایک صاحب نظر کا اظہار

08 آپ کے خط — مدیر اعلیٰ
سسپنس کی مجلس مشاورت وقارئین کی تلخ و شیریں باتیں گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

14 مسیحا — زویا اعجاز
ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

47 لمبا ہاتھ — تنویر ریاض
خوش گمانیوں میں مبتلا مجرم دوستوں کی حیرانیوں کا احوال

57 رازِ کائنات — ناہید سلطانہ اختر
دو مختلف نظریات اور سچائی کے مابین دلچسپ معرکہ آرائی

62 رنگ آسماں — اے آر راجپوت
مشرق و مغرب کے عجب امتزاج اور تاریخی خونریزیوں کے عبرت اثر اشاروں میں لہراتی دلچسپ داستان

87 گھر کا بھیدی — اصفہ ضیا احمد
خوابوں کے پیچھے بھاگنے والی ایک حسینہ کی نادانیاں

101 انوکھا بلیک میلر — ایم الیاس
انوکھا طریقہ اور انوکھی واردات کا سنسنی خیز ماجرا

113 شناسا اجنبی — شاہ زین رضوان
عجیب مگر کچھ چند دنوں کی محبت کا ایک خوب صورت نذرانہ

جلد 48 • شمارہ 12 دسمبر 2019 • زرسالانہ 1200 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 100 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

122 بند گلی
ملک صفدر حیات
قانون کے سامنے خونی بھیڑیوں کی حقیقت کھولنے والے ملک صاحب کا کارنامہ

151 چراغ تلے
منظر امام
''چراغ تلے اندھیرا'' کی افسوس ناک تفسیر

155 ہم سفر
ثمر عباس
کھوئے ہوئے رشتوں کو پالینے کی خوشی کا دلفریب منظر

163 بیک اسٹوری
صبا مغل
ایک جھوٹ کو پیار سے نبھانے والے ناکام عاشق کی کامیابی

168 محفلِ شعر و سخن
قارئین
آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ آپ کی پسند، آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

171 حبس
نعمان اسحاق
دھیرے دھیرے اندر کی گھٹن اور باہر کے حبس سے آزادی پانے والے دوستوں کا قصہ

175 بھول
کبیر عباسی
قدرت کے انتقام سے بے خبر ایک گھمنڈی انسان کی کتھا

186 وقت
حسام بٹ
ایک پرعزم بازی گر کی بازی گری...... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک دلربا طویل داستان

237 خاموشی
مظہر سلیم ہاشمی
خاموشی سے وار کرنے والی ایک خطرناک بلا کا انداز

247 احمد بن حنبلؒ
رضوانہ ساجد
بستی بستی، نگری نگری علم کے ایک شیدائی کی روداد

255 وارننگ
اعتزاز سلیم وصلی
وقت کی وارننگ کے دام میں الجھے مجرموں کا انجام

262 پسِ پردہ
طاہر جاوید مغل
انجانی نفرتوں میں پناہ تلاش کرنے والا اس جوڑے کی کتھا جو...... اپنوں کے اصل روپ سے بے خبر تھا

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

بیرون ممالک مقیم اُردو صارفین ہر ماہ اپنے پسندیدہ ڈائجسٹ بذریعہ ای میل پی ڈی ایف فارمیٹ میں حاصلکریں

تفصیلات کے لیے مندرجہ ذیل ای میل پر رابطہ کریں۔

urdusoftbooks@gmail.com

urdusoftbooks.com

یہ سروس بذریعہ پے پال مناسب قیمت پر دستیاب ہو گی

بذریعہ ای میل رابطہ کرنے کے لیے یہاں کلک کریں

انشائیہ

قانون

جون ایلیا

''تم باہر تو جا رہے ہو مگر تمہیں کسی نے اغوا کرلیا تو......''

''ہوں......میں باہر تو جا رہا ہوں مگر مجھے کسی نے اغوا کرلیا تو...... مجھے کسی نے اغوا کرلیا تو......''

''مگر تم مجھے خواہ مخواہ دہلاتے رہتے ہو۔''

''میں خواہ مخواہ دہلاتا رہتا ہوں...... تمہیں مقدس صحیفوں کی قسم، کیا تم یہ بات دل سے کہہ رہے ہو؟''

''تو پھر تم بھی میرے ساتھ چلو۔''

''میں بھی تمہارے ساتھ چلوں......مگر ہم دونوں کو اغوا کرلیا گیا تو......؟''

''ہاں یہ تو ہے۔ اگر ہم دونوں کو اغوا کرلیا گیا تو......تو پھر؟''

''تو پھر یہ کہ باہر تو جانا ہی ہوگا، ہم اندر کب تک رہ سکتے ہیں؟ باہر ہی تو ساری زندگی ہے۔ باہر ہی تو سب کچھ ہے۔ ہمارے نام بھی تو ہمارے باہر ہی ہیں۔ ہماری پہچان بھی تو باہر ہی ہے اور یہ کہ تم بھی تو میرے باہر ہی ہو......اور میں بھی تو تمہارے باہر ہی ہوں......اور میرے اور تمہارے سانس بھی تو باہر ہی ہیں۔''

''میرے بھائی! آخران بستیوں کو ہو کیا گیا ہے؟ وہ کون لوگ ہیں جو نہ جانے کہاں سے یہاں آ گئے ہیں؟ معراج رسول، جمال احسانی، انیق، جاوید آدرش، شہزاد اور خالد ادریس اور شاہد ہمایوں! تم نے اسی بستی میں ہوش سنبھالا ہے، تم بتاؤ کہ یہ لوگ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں......؟''

''یہ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لوگ باہر سے آئے ہیں؟ کہیں یہ لوگ ہمارے اور تمہارے اندر سے تو نہیں نکل آئے؟''

''ہاں، ایسا ہو تو سکتا ہے کہ یہ لوگ ہم ہی میں سے برآمد ہوئے ہوں......اور ایک دوسرے کو خود ہی اغوا کرلیتے ہوں۔ مگر پہلے تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ ہوتا تھا مگر کبھی کبھی ہوتا تھا مگر اب تو یہ روز کا معمول بن گیا ہے۔ ایسا کیوں ہوا ہے؟ یہ گلیاں، یہ نکڑ، یہ راستے، یہ شاہراہیں اور یہ بستیاں اتنی مہلک اور مہیب کیوں ہوگئی ہیں؟ ہم نے تو ان بستیوں کو بڑے چاؤ سے بسایا تھا، ہم نے تو اپنے مسکنوں کو اجاڑ کر ان بستیوں کو اپنا مسکن بنایا تھا......تو پھر یہ بستیاں ہمارے حق میں، ہم میں سے ایک دوسرے کے حق میں اتنی نامہرباں کیوں ہوگئی ہیں؟ میرا نام زید ہے، میں اردو بولتا ہوں اور میں اس بستی میں غیر محفوظ ہوں۔ میرے ایک دوست کا نام مہتاب منگریو ہے، وہ سندھی بولتا ہے اور وہ بھی اس بستی میں غیر محفوظ ہے۔ میرے ایک اور دوست کا نام عثمان بلوچ ہے، وہ بلوچی زبان بولتا ہے۔ اردو بھی جانتا ہے، وہ بھی اس بستی میں غیر محفوظ ہے۔ میرا اپنا ایک آدمی ہے، اس کا نام نذیر لغاری ہے، وہ بابا فرید کے شہر کا رہنے والا ہے اور وہ بھی اس بستی میں غیر محفوظ ہے۔ اور میرا ایک یار ہے افتخار جالب، جو پنجابی اور اردو میں لکھتا ہے۔ اسی بستی میں رہتا ہے اور وہ بھی اس بستی میں غیر محفوظ ہے۔''

''مگر پہلے تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اب ایسا کیوں ہوتا ہے؟ پہلے اگر ایسا ہوتا بھی تھا تو بہت کم ہوتا تھا۔''

''سننا چاہتے ہو......؟ یہ قانون کی شکست ہے۔ یہ قانون کی بے حرمتی ہے اور یہ قانون کی معزولی ہے۔''

''ہیں......قانون کو کس نے معزول کیا؟ قانون کی کس نے بے حرمتی کی؟''

''قانون کو کس نے معزول کیا، قانون کی کس نے بے حرمتی کی......میرے بھائی! کیا تم یہ بات بھی نہیں جانتے؟ یہ بات تو کریم سبزی فروش بھی جانتا ہے اور یہ بات تو خلیفہ مجید کے اکھاڑے کے پٹھے بھی جانتے ہیں......اور یہ بات تو تو جیب تراش بھی جانتا ہے۔ کیا میں اس سے آگے بھی کچھ کہوں؟ یہ بات تو وہ لوگ بھی جانتے ہیں جو حکومت کی گدی پر بیٹھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے قانون بنایا اور اب جو فرق پڑا ہے، وہ یہ ہے کہ عام آدمیوں نے بھی قانون سے کھیلنا شروع کردیا ہے۔ جب تک قانون بنانے والے قانون کا احترام نہیں کریں گے تو بستیوں اور شہروں کے عام لوگ بھی اس کا احترام نہیں کریں گے۔ حکمرانوں سے کہو کہ وہ عام آدمیوں سے یہ سمجھوتا کریں کہ جو قانون ہم نے بنایا ہے، ہم بھی اس کا احترام کریں گے اور تم بھی اس کا احترام کرو گے اور نہیں......اور اگر نہیں تو نہیں، ہرگز نہیں۔ اگر عام آدمی کو قانون کا پابند بنایا گیا تو پھر خاص آدمیوں کو بھی اس قانون کی پابندی کرنی پڑے گی۔ اگر قانون کی دوطرفہ رعایت نہیں کی گئی اور اس کی حرمت کو برقرار نہیں رکھا گیا تو پھر ان بستیوں میں جنگل کے درندے ہی آ کر آباد ہوں گے۔

آپ کے خط

عزیزان من

السلام علیکم!

2019ء کا آخری شمارہ وقت کی تیز رفتاری کا احساس دلا رہا ہے۔ اگرچہ زندگی کی مصروفیات میں قطعی یاد نہیں رہتا مگر دسمبر ہر بار سال کے بچھڑنے کا ادراک ضرور دیتا ہے۔ گزشتہ دنوں بصد عقیدت و اہتمام کے ساتھ محسن انسانیت کی ولادت باسعادت کے سلسلے میں جشن عید میلاد النبیؐ بڑے جوش و جذبے سے منایا گیا۔ آپؐ نے زندگی کے ہر پہلو کے حوالے سے اصول و ضوابط بہت واضح انداز میں بتائے اور ہمیں اخلاق و مساوات اور انصاف کا درس دیا لیکن انسان واقعی خسارے میں ہے جو صرف دنیا سے ہی ساری امیدیں باندھے رکھتا ہے اور فرائض بھول جاتا ہے۔ 25 دسمبر بھی ہمیں یاد دلاتا ہے کہ امیدیں تو ہمارے قائداعظم محمد علی جناح نے بھی ہم سے بحیثیت قائد کے بہت باندھی تھیں مگر ہمیں آج تک ان کا احساس تک نہ ہوا۔ کچھ کاندھوں پر اللہ رب العزت کچھ خاص ذمے داریاں ڈالتا ہے اور یہی ان کی آزمائش بھی ہوتی ہے۔ چاہیں تو انصاف کے تقاضے پورے کردیں اور چاہے تو نظرانداز کردیں، بدقسمتی سے ہمارے ہاں دوسری بات پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ خدا جانے اس ''دھرنا اور ورنہ'' کے درمیان کب تک بلانتائج معرکہ آرائی جاری رہے گی۔ موجودہ وقت میں ملکی معروف سیاسی جماعت نے جو قدم اٹھایا ہے، دیکھتے ہیں کہ اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے اگرچہ ملکی معیشت کی تباہ حالی اور اس کے نتیجے میں بڑھتی ہوئی مہنگائی اور غربت کی شرح سے ہر شخص فکرمند ہے۔ ہر بنیادی چیز عوام کی دسترس سے دور ہوتی جارہی ہے۔ چاہے بیان بازی کچھ بھی ہوتی رہے نہ صرف روزگار بلکہ عوام کو تمام سہولیات فراہم کرنا صاحبانِ اقتدار کی ہی ذمّے داری ہے، خواہ یہ روزگار سرکاری شعبے میں ہو یا نجی شعبے میں۔ اگرچہ ساری دنیا دیکھ رہی ہے کہ ان دنوں صنعت و تجارت سے وابستہ لوگ مختلف پالیسیوں کے سبب فیکٹریوں اور کارخانوں کو بند کررہے ہیں۔ وطنِ عزیز ان دنوں جس بحران سے گزر رہا ہے، وہ پوری قوم کے لیے باعثِ تشویش ہے۔ کہیں ٹرین حادثے میں بے شمار انسان جل کر ہلاک ہورہے ہیں تو کہیں ڈینگی وائرس کے آگے محکمۂ صحت بے بس ہے۔ کیا یہی فلاحی ریاست کا تصور ہے؟ جہاں سبزی فروش، ٹماٹر تین سو روپے کلو دے رہے ہوں اور جہاں گیس اور بجلی جیسے محکمے اپنی من مانی کرنے سے باز نہ آتے وہاں ریلیوں اور دھرنوں کی صورت احتجاج کے اچھے نتائج کے لیے دعا کرنی چاہیے۔ اب ہر شخص کے ذہن میں یہ سوچ ابھر رہی ہے کہ اس مارچ کا انجام آخر کیا ہوگا؟ محبِ وطن عوام دعاگو ہیں کہ معاملہ خوش اسلوبی سے حل ہوجائے۔ انہی دعاؤں کے ساتھ ساتھ اب چلتے ہیں اپنی محفل کی جانب جہاں سسپنس کے چاہنے والے ہمارے منتظر ہیں۔

✠ ریاض بٹ کی تعریف حسن ابدال سے ''ماہ نومبر 2019ء کا شمارہ بک اسٹال کے تین چکر لگانے کے بعد 21 اکتوبر کو منتظر نگاہوں کی آسودگی کا باعث بنا۔ سرورق کے متعلق اتنا ہی کہوں گا کہ تعریف اس کی جس نے تجھے بنایا...... اور ہمارے ہر دل عزیز پرچے کی زینت بنایا...... سرورق پر مزید تبصرہ موقوف کرتے ہوئے بڑھتے ہیں جون ایلیا کے انشائیہ (اندازہ) کی طرف۔ واقعی پاکستان کی فاقہ کش، بے روزگار، فلاکت زدہ اور درماندہ قوم موجودہ حالات کی آخر کب تک متحمل ہوسکتی ہے۔ صاحب اقتدار اور صاحب اختیار لوگوں کو سوچنا چاہیے۔ یہ نہ ہو، حالات کی ماری قوم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوجائے...... خطوط کی محفل بھی خوب سجی ہوئی ہے۔ محمد انور ندیم واقعی آپ کا خط پہلے نمبر پر شائع ہونے کا حقدار تھا۔ بڑا اچھا اور مدلل تبصرہ ہے۔ آپ نے 26 نومبر کی تاریخی اہمیت اجاگر کی، ویل ڈن۔ جاوید اختر رانا کا تبصرہ اور دعائیں قابلِ قدر بھی ہیں اور قابلِ تعریف بھی۔ چلبلی ہیر، آپ نے یہ بات خوب لکھی کہ محفل میں ہلا گلا ہونا چاہیے۔ بالکل خشک محفل نہیں ہونی چاہیے (کراچی میں پانی کی قلت بہت ہے لہٰذا خشکی تو آپ ہی آئے گی) بھئی شادی کی ایڈوانس مبارک باد لیکن ایک بات کا

تیسرا حصہ

مسیحا

زویا اعجاز

میدانِ جنگ میں نام اہم ہوتے ہیں نہ مقام...اس میدان میں تو حوصلہ اور جرأت سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور...نورالدین زنگی کا وجدان اسے مسلسل خطرات سے آگاہ کررہا تھا۔یہ مردِ مجاہد ذاتی طور پر بہت رحمدل، انسانیت پسند اور مسلم امہ میں محبت و اخوت برقرار رکھنے کا خواہشمند تھا اور اسی خواہش کی تکمیل کے لیے وہ جہدِ مسلسل میں مصروف تھا جب کہ صلیبی فوج ایک طرف تو لوٹ مار میں حاصل ہونے والی اشیا، معصوم بچوں کی خونریزی اور خواتین کی عصمت دری سے کشید ہونے والی لذّتوں میں گم تھی مگر دوسری جانب وہ مسلم سپاہ کا نظم و ضبط، دیوانگی اور سکون دیکھ کر بری طرح خوفزدہ بھی تھی بالخصوص نورالدین زنگی کے ایک نڈر امیر مجدد الدین کی شمشیر بے نیام نے صلیبی افواج کی نیندیں اڑا کر رکھ دی تھیں کیونکہ...میدانِ جنگ میں نام اہم ہوتے ہیں نہ مقام...بس حوصلے اور جرأت کی ضرورت ہوتی ہے جو امیر مجددالدین نے قدم قدم پر ثابت کردکھایا۔

ماضی کا آئینہ۔بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

قلعہ حلب کے عملے میں محافظوں کی نمایاں تبدیلی کو دیکھ کر مجددالدین کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔

’’میرے سابقہ محافظ کہاں ہیں؟‘‘ وہ درشت لہجے میں گویا ہوا۔

’’امیر! ہمیں محترم نصرت الدین نے یہاں تعینات کیا ہے۔سابقین کو تبدیل کردیا گیا ہے۔وجہ خود سلطان کے بھائی ہی جانیں۔‘‘ کماندار کے بتانے پر مجدد کا چہرہ طیش سے سرخ ہوگیا۔اس نے شمس الدین اور حطلخ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

’’تم لوگ فوراً پہلے محافظوں کو یہاں حاضر کرو۔‘‘ ان دونوں نے اثبات میں سر ہلایا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر سرپٹ دوڑا دیا۔مجددالدین دوبارہ نئے کماندار کی طرف متوجہ ہوگیا۔

’’اپنا سامان باندھ کر ان سبھی افراد کے ساتھ وہاں چلے جاؤ جہاں اس سے قبل متعین تھے۔‘‘

’’لیکن حضور وہ......‘‘ کماندار نے نصرت الدین کی جانب اشارہ کرنا چاہا۔

’’نصرت الدین کو بلاجھجک بتادینا کہ تم لوگوں کو میں نے تبدیلی کا حکم دیا ہے۔‘‘ اس نے درشتی سے حکم دیا۔

کماندار الجھے ہوئے انداز میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہاں سے روانہ ہوگیا۔تھوڑی ہی دیر میں حطلخ اور شمس الدین سابق محافظین کے دستے کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔مجددالدین نے ان کے کماندار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

’’اپنا اور ساتھیوں کا سامان اندر رکھوا کر فوراً میرے پاس آؤ۔‘‘

کماندار اس حکم اور مجدد کے غیر معمولی انداز پر تشویش زدہ ہوگیا۔اس الجھن میں وہ قلعے کے دائیں اور بائیں سمت میں بنے کمروں میں سامان رکھوا کر امیر کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

’’تم نے کس کی اجازت سے قلعے کی حفاظت ترک کی؟‘‘ وہ سختی سے بولا۔

’’امیر! میں بے قصور ہوں۔میں تو حکم کا غلام ہوں۔سلطان محترم کے بھائی نے شاہی کروفر سے برتاؤ کرتے ہوئے مجھے یہاں سے ہٹا کر اپنی پسند سے نئے محافظ متعین کر دیے تھے۔حکم عدولی کرتا تو وہ میری گردن کاٹ کر علیحدہ کر دیتے۔‘‘ کماندار نے لرزتے ہوئے اپنی صفائی پیش کی۔

’’میں اس حکم کی تعمیل پر تمہاری گوشمالی نہیں کررہا۔‘‘ مجدد نے قدرے نرمی دکھائی۔’’تمہیں اس کی بابت مجھے اعتماد میں لینا چاہیے تھا۔‘‘

’’امیر! میں اپنی یہ غلطی تسلیم کرتا ہوں۔‘‘ اس نے

رچرڈ، گیلووے گیلری کے سامنے کھڑا دروازے پر لگے ہوئے اس بورڈ کو دیکھ رہا تھا جس پر لکھا تھا۔ "پرائیویٹ تقریب، داخلہ بذریعہ کارڈ۔" یہ گیلری سینٹ ہیلینا کے قلب میں اینٹوں سے بنی ہوئی ایک پرانی عمارت میں واقع تھی۔

ایک کھڑکی میں گولڈ اسٹار سروس فلیگ لٹکا ہوا تھا جبکہ دوسری کھڑکیوں سے لوگ گیلری کے اندر ٹہلتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے قیمتی ڈیزائنر جینز اور سوتی قمیصیں پہن رکھی تھیں اور وہ دیکھنے میں ہی کھاتے پیتے گھرانے کے افراد

لمبا ہاتھ

تنویر ریاض

جب اپنی اوقات اور حقیقت کو انسان فراموش کردے تو اکثر قدرت کو ایسا جوش آتا ہے کہ وہ خود پر گھمنڈ کرنے والے کو مکھی سے زیادہ حقیر ثابت کردیتی ہے۔ کچھ ایسا ہی حال ان بے چاروں کا ہوا جو ہوشیاری دکھاتے دکھاتے چاروں شانے چت ہوگئے... جو لمبا ہاتھ مارنے نکلے تھے مگر بالشت بھر میں ہی ان کی اوقات واضح ہوگئی... اسے کہتے ہیں جیسی کرنی ویسی بھرنی۔

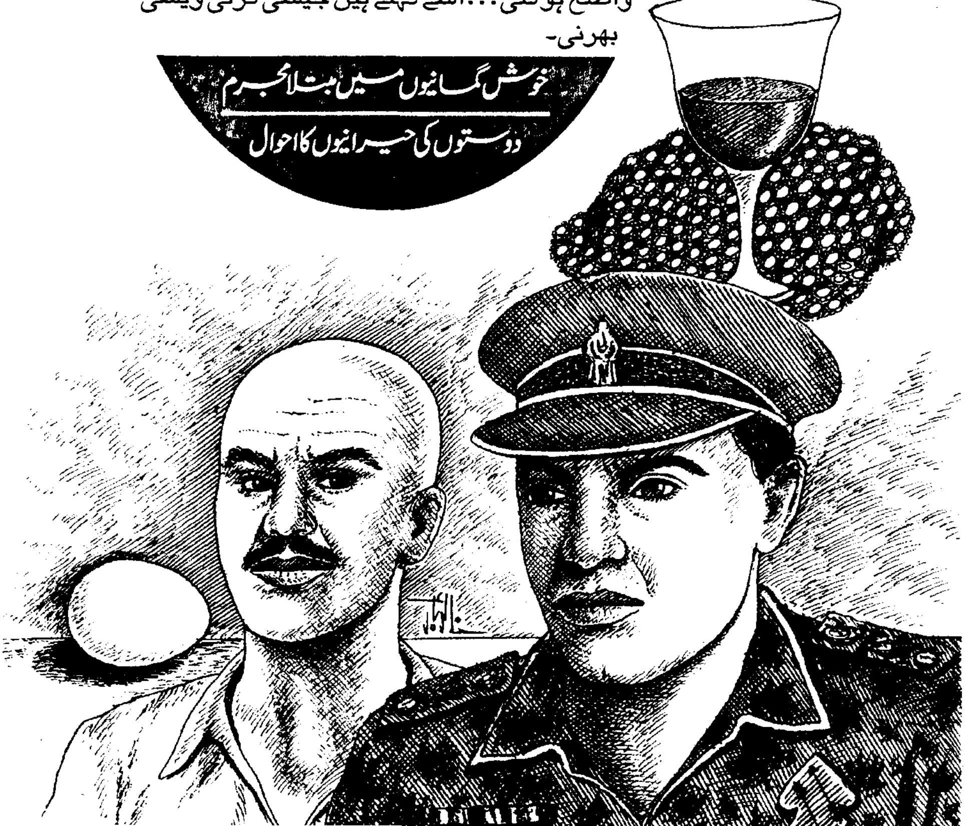

لگ رہے تھے۔

اس نے اپنی خاکی پتلون، نیلے بلیزر کوٹ اور کالر پر لگی ہوئی پن پر نظر ڈالی۔ اسے امید تھی کہ کیتھرائن کو یہ روپ پسند آئے گا۔ یہ ایک سادہ سا فوجی لباس تھا جس میں کوئی چمک دمک اور فیشن نہیں نظر آرہا تھا۔ اس نے سگریٹ کا آخری کش لیا اور سڑک پر پھینک کر اسے جوتے سے مسل دیا پھر وہ گیلری کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

ہال کے اندر ہلکی ہلکی موسیقی اور لوگوں کی آوازوں نے سماں باندھ رکھا تھا۔ دروازے کے ساتھ ہی استقبالیہ کاؤنٹر پر ایک عورت بغیر آستینوں اور کھلے ہوئے گلے کا لباس پہنے ہوئے بیٹھی تھی جس میں اس کا جسم نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ پرکشش اور خوب صورت عورت تھی اور ایک بار دیکھنے کے بعد اس پر سے نظریں ہٹانا ممکن نہ تھا۔ اس کے سینے پر نام کا بیج لگا ہوا تھا جس پر لکھا ہوا تھا۔ ''نکول۔''

''یہ ایک پرائیویٹ تقریب ہے۔'' نکول نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''عام لوگوں کے لیے گیلری صبح کھلے گی۔''

رچرڈ نے جیب سے دعوت نامہ نکالا اور میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں کیتھرائن کا دوست ہوں۔''

اسے امید تھی کہ گیلری کی مالکن کا نام سنتے ہی نکول کا رویہ بہتر ہو جائے گا اور کم از کم اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ ضرور آجائے گی لیکن اس کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

''یہ الٹی لگی ہوئی ہے۔'' نکول نے سرگوشی کی۔

اس نے چونک کر میز پر رکھے ہوئے دعوت نامے کو دیکھا۔

نکول نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''دعوت نامہ نہیں..... تمہاری پن۔''

اس نے کوٹ کے کالر کو دیکھا۔ اسپیشل فورس پن کے دونوں تیر نیچے کی جانب جھکے ہوئے تھے۔ اسے یقین نہیں آیا کہ وہ ایسی غلطی کر سکتا ہے۔ وہ شرمندہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''دراصل میں جلدی میں تھا۔''

''میں ٹھیک کر دیتی ہوں۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی اور اس کے قریب آکر پن کا زاویہ درست کرنے لگی۔ ''کسی نے غور نہیں کیا ہوگا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا جیسے اسے اس کی پریشانی کا احساس ہو رہا ہو۔ ''بہت سے لوگ اس فرق کو محسوس نہیں کر سکتے۔''

''شکریہ.....'' رچرڈ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اس کی ضرورت نہیں۔'' اس نے ایک میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس پر شراب کی بہت سی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ ''تم وائن سے لطف اٹھاؤ۔ کیتھرائن تھوڑی دیر میں آنے والی ہے۔''

وہ میز پر گیا۔ سرخ شراب کی بوتل منتخب کی، اپنے لیے ایک گلاس بھرا اور ایک ہی سانس میں اسے خالی کر دیا پھر اس نے دوسرا گلاس بھرا۔ اسے خالی کرنے کے بعد گہری سانس لی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

گیلری کافی کشادہ تھی اور اس کی تمام دیواروں پر پینٹنگز اور تصاویر آویزاں تھیں۔ مشرقی اور مغربی دیواروں پر خفیہ کیمرے نصب تھے۔ وسط میں چمڑے کے کشن والی کرسیاں اور بڑی سی میز تھی جس پر مٹی کے برتن اور لکڑی کے پیالے رکھے ہوئے تھے۔ یہ بالکل ویسا ہی منظر تھا جو وہ آن لائن دیکھ چکا تھا۔

''ڈکی ڈارلنگ! مجھے خوشی ہے کہ تم یہاں آئے۔'' کیتھرائن نے اس کے عقب سے آواز لگائی۔ اس نے بھی بغیر آستینوں اور کھلے گلے کا لباس پہن رکھا تھا جس میں اس کے عریاں کندھے اور جسم کے نشیب و فراز پوری طرح نمایاں ہو رہے تھے۔ اس نے چہرے پر پورا میک اپ کیا ہوا تھا اور اس کے جسم سے بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی..... وہ بے باکانہ انداز میں آگے بڑھی اور باری باری رچرڈ کے دونوں گالوں کا بوسہ لے لیا۔

''میں تمہارے لیے پھول لانا چاہ رہا تھا۔'' وہ اپنے پیروں کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس موقع پر یہ مناسب ہوگا یا نہیں۔''

''میرے لیے یہی خوشی کی بات ہے کہ تم سے ذاتی طور پر ملاقات ہوگئی۔'' وہ سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔

''کوئی اور فوجی بھی یہاں آیا ہے؟'' وہ کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

''یہاں زیادہ تر سلیکون ویلی کے نمائندے آئے ہوئے ہیں۔ آج رات ایک بڑا فنڈ ریزنگ شو ہے اور اگلے ہفتے نیلام ہوگا۔'' وہ اپنی بھویں اوپر اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''امید ہے کہ کوئی ایسا شخص نظر آجائے گا جسے تم جانتے ہو۔''

''میں جس شخصیت کو دیکھنا چاہتا ہوں، وہ صرف تم ہو۔'' وہ اپنے چہرے پر بھرپور مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔

وہ بھی جواب میں مسکرا دی اور اپنا بازو اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولی۔ ''آؤ، میں تمہیں گیلری دکھاؤں۔''

وہ مختلف تصویروں کے پاس سے گزرے۔ ان میں ہرے بھرے انگور کے باغات، کھیتوں میں استعمال ہونے والے آلات، بڑے بڑے گودام، کسانوں اور کھیت میں

رازِ کائنات

ناہید سلطانہ اختر

یہ طے ہے کہ ہر ذی روح اس دنیا میں اپنے جنم دینے والوں کی مرضی سے نہیں بلکہ ربِ کائنات کے حکم سے دنیا میں آتی ہے... یہی بات اس غیر مسلم کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی جسے اس بات کا تو یقین تھا کہ کتابیں خودبخود وجود میں نہیں آتیں بلکہ انہیں کوئی لکھتا ہے... لیکن بالآخر اسے تسلیم کرنا ہی پڑا کہ اتنی وسیع کائنات خالق کے بغیر وجود میں آہی نہیں سکتی۔

دو مختلف نظریات اور سچائی کے مابین

دلچسپ معرکہ آرائی

عبداللہ کی عادت تھی کہ سواری کے انتظار میں ٹیکسی سے باہر نکل کر سواریوں پر گھات لگانے یا ساتھی ڈرائیوروں سے گپ شپ کرنے کے بجائے وہ عموماً اپنی ٹیکسی ہی میں بیٹھ کر وظائف و اوراد میں مشغول رہنے کو ترجیح دیتا۔ فرصتِ عمر کم تھی جو وقت یادِ الٰہی میں بسر ہوجائے غنیمت۔ گاڑی میں اس نے ایک عدد تسبیح، وظائف کی کتاب اور چھوٹے سائز کا قرآن مجید بھی رکھا ہوا تھا۔ جب اس کے ساتھی ڈرائیورز ایک دوسرے سے گپ شپ میں لگے ہوتے تو وہ نہایت خشوع

خضوع سے تسبیح کے دانوں پر کوئی وظیفہ کررہا ہوتا یا قرآن مجید ورنہ کتاب وظائف کھولے بیٹھا ہوتا۔ یہ بات نہیں کہ وہ مردم بیزار تھا یا ساتھی ڈرائیوروں سے اس کی بنتی نہ تھی۔ سب اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ اکثر اپنے کاروباری ہی نہیں، نجی مسائل میں بھی اس سے مشورہ اور ہدایت کے طلب گار ہوتے۔ کبھی کسی کو پیسوں کی ضرورت ہوتی تو سب سے پہلے اسی سے رجوع کیا جاتا۔ کسی کی مدد کرنے یا قرض دینے میں وہ خست نہیں برتتا تھا بشرطیکہ اس کی جیب اجازت دیتی، خود مدد کرنے سے قاصر ہوتا تو دوسروں سے کہہ سن کر حاجت روائی کی کوشش کرتا۔

یاداللہ اس کے لیے روزگار میں تو برکت کا باعث تھی ہی، اکثر دیگر معاملاتِ حیات میں بھی ایسی آسانیوں کا موجب بنتی جو خود اس کے لیے بھی حیران کن ہوتیں۔ کہاں سے مدد آئی۔ کس ان دیکھے ہاتھ نے ڈوبنے سے سنبھالا۔ کس غیبی کمک نے بگڑی بنادی...... یہ سب ناقابلِ فہم ہوتا...... اور اللہ سے اس کا تعلق اور گہرا اور مضبوط ہوجاتا۔

اس روز بھی وہ گاڑی میں بیٹھا سر پر ٹوپی اوڑھے اتنے انہماک سے قرآن مجید پڑھ رہا تھا کہ اسے سواری کے اپنی ٹیکسی کے نزدیک رکنے کی خبر گاڑی کے بند شیشے پر کھٹکھٹاہٹ سے ہوئی۔ عبداللہ چونکا اور اس نے اپنے بائیں پہلو پر جھکتے ہوئے بند شیشہ نیچے کردیا۔

''ڈیل جاؤ گے؟'' سواری نے پوچھا۔

''کیوں نہیں جناب۔''

''کتنا کرایہ لو گے؟''

اپنی غیر معمولی یادداشت کی بنا پر عبداللہ کو یاد آگیا کہ وہ شخص پہلے بھی اس کی ٹیکسی میں سفر کرچکا تھا۔

''آپ تو جاتے ہوں گے...... آپ کو معلوم ہوگا کتنا کرایہ بنتا ہے۔'' عبداللہ نے اس کی خوش پوشی کو توصیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے متانت سے کہا۔

''چالیس پونڈز۔''

''بیٹھیں۔''

وہ اگلی نشست پر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا اور اپنا بریف کیس اس نے اپنے زانوؤں پر رکھ لیا۔ اس کا لباس، چمچماتے جوتے، نہایت سلیقے سے آراستہ بال، عمدہ بریف کیس، اس کے وجود سے اٹھتی کسی مہنگی خوشبو کی مہک اور اس کے چہرے پر بکھری رعونت اس کی مستحکم معاشرتی اور معاشی حیثیت کے نقیب تھے۔

عبداللہ نے قرآن مجید کو نہایت احترام سے ڈیش بورڈ پر رکھا۔ سر سے ٹوپی اتار کر دُہری کی اور ڈیش بورڈ کے انتہائی دائیں گوشے میں رکھنے کے بعد چابی گھما کر گاڑی اسٹارٹ کی۔

سواری دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم پیوست کیے ہاتھ بریف کیس پر دھرے ونڈ اسکرین پر نظریں لگائے ہوئے تھی۔

عبداللہ نے گاڑی رینک سے نکالی۔

''مجھے یاد پڑتا ہے میں پہلے بھی تمہاری ٹیکسی میں سفر کرچکا ہوں۔'' سواری نے آغازِ کلام کیا۔

''جی...... درست۔'' عبداللہ بولا۔

''تو کیا تمہیں بھی یاد ہے؟'' وہ چونکا۔

''بہت اچھی طرح۔''

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''عبداللہ۔''

''مسلمان ہو؟''

''رب کی مہربانی سے۔''

''میرا نام ڈیوڈ جانسن ہے۔''

''اور جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے، تم نے پچھلی بار میری ٹیکسی میں سفر کے دوران بتایا تھا کہ تم بیرسٹر ہو۔''

''حیرت انگیز!'' وہ اچھل پڑا۔ ''اس عمر میں بھی تمہاری یادداشت غضب کی ہے۔'' ڈیوڈ نامی سواری نے حیرت کا اظہار کیا۔

''کیا مطلب ہے! اتنا بوڑھا تو نہیں ہوں میں۔''

''نہیں نہیں، میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔''

''میں بھی مذاق کررہا تھا...... بوڑھا تو واقعی ہوچکا ہوں مگر شکر ہے کہ...... ہاتھ، پاؤں، دل، دماغ سب ابھی صحیح کام کرتے ہیں۔''

''تمہاری قوتِ ارادی کا کمال ہے۔''

''رب کی مہربانی جس نے کائنات بنائی۔''

''کائنات کسی نے نہیں بنائی...... خود وجود میں آئی ہے...... بگ بینگ سے۔'' وہ بولا۔ عبداللہ نے کچھ کہنا چاہا مگر وہ عبداللہ کے بولنے سے پہلے ہی گویا ہوا۔ ''بگ بینگ تو سمجھتے ہونا؟''

''بالکل سمجھتا ہوں...... عظیم دھماکا...... جس کے نتیجے میں ...... سائنسدانوں کے خیال میں یہ کائنات وجود میں آئی۔''

''خیال میں نہیں...... درحقیقت ایسا ہی ہے...... اربوں سال پہلے نہ یہ زمین تھی، نہ سورج، چاند، ستارے۔

چھبیسواں اور آخری حصہ

رنگ آسماں

اے۔آر۔راجپوت

ماضی کی تنگ و تاریک مگر خوابناک راہداریوں سے جنم لینے والے ایسے کردار... جنہیں واقعات و شواہد نے خود ترتیب دے کر ان کی زندگی کی بے قراریوں کو ایک ایسے مقصد میں ڈھال دیا جس کا ادھورا پن بے شمار ہلاکتوں کا سبب بن جاتا... لہٰذا اس کی تکمیل کے لیے وہ باغی فطرت انسان میدان جنگ میں یوں اترا کہ دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کردینے والے گداز احساسات کو بھی بھول گیا لیکن... عشق تو پھر عشق ہوتا ہے... کوئی کتنا ہی بھولنا چاہے، عشق اپنا مسکن کبھی نہیں بھولتا۔ جس دل میں بس جائے اسے اپنے ساتھ ہی لے کر جاتا ہے... اور پھر ایک دن اچانک اس کے من کا موسم بھی بدل گیا کیونکہ... وہ فرنگی حسینہ دلی کے اس نوجوان کو دل دے بیٹھی تھی، جس کا ہر قدم آزمائش اور ہر نظر کسی امتحان سے کم نہ تھی، اس کے باوجود... خاک و خون کے اس کھیل میں نہ تو اس نے خوابوں کو بکھرنے دیا اور نہ ہی جذبوں کو بے لگام ہونے دیا۔ کیونکہ وہ آسمان پر بکھرے رنگوں کا مطلب جان گیا تھا۔

مشرق و مغرب کے عجب امتزاج اور تاریخی جنوں خیزیوں کے عبرت اثر اشاروں میں لہراتی دلچسپ داستان

یہ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد کے دور کی داستان ہے۔ کوہِ شالیہ کے گھنے جنگلوں اور سنگلاخ پہاڑیوں میں ایک مختصر قافلہ محوِ سفر ہے۔ اس قافلے کا سالار ایک انگریز پروفیسر ہنری برنارڈ ہے، جو ایک مختلف سوچ، وضع دار اور مثبت خیالات کا حامل شخص ہے۔ ہندوستان کی قدیم اسراریت اور جستجو اسے لندن سے یہاں تک کھینچ لائی ہے۔ اس قافلے میں اس کی جوان اور حسین بیٹی رینا بھی شامل ہے۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی فطرتاً تجسس پسند اور مہم جو ہے۔ پروفیسر ہنری کا ایک اوباش بھتیجا رابرٹ اور اس کی آزاد خیال جوان بہن گارشیا بھی ساتھ ہیں۔ ملازمین میں ڈرائیور امجد خان، ادھیڑ عمر خانساماں میاں بیوی نندو اور شانتا کے علاوہ ایک کڑیل نوجوان شوکت حسین بھی اس قافلے میں شامل ہے۔ یہ جنرل مائیکل شا کے سائیس کریم بخش کا اکلوتا بیٹا ہے۔ شوکت عرف شوکی، رینا کو دل بیٹھا ہے مگر مزاجاً گھمنڈی اور مغرور فطرت رابرٹ کو شوکی سے سخت قسم کی رقابت اور ذاتی عناد ہے۔ پروفیسر ہنری کے برعکس رابرٹ، شوکی سمیت دیگر ملازموں کے ساتھ آقا و غلام جیسا رویہ روا رکھے ہوئے ہے۔ پروفیسر ہنری برنارڈ اپنی اس مہم جوئی کے دوران ایک پراسرار بستی کا کھوج لگاتا ہے۔ کوہِ شالیہ کی تین خودمختار ریاستوں پر فرنگی سامراج اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے مختلف سازشوں میں مصروف ہیں اور انہی سازشوں کو سبوتاژ کرنے کے لیے پانچ مسلم اور جری جانباز گوریلوں کا گروپ اپنی جانیں جوکھم میں ڈالے ہوئے ہے۔ اس گروپ میں علی ریحان ہے جو فوجِ آزادی کے سپہ سالار جنرل ثمیر خان کے ایک خاص کمانڈر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے بارود کا ماہر کہا جاتا ہے۔ دوسرا احسان جامو، جو کرنل نہال خان کا قریبی ساتھی ہے۔ شاہ زمان ان کا تیسرا ساتھی بذاتِ خود ایک لیڈر کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ گروپ ''کاروانِ مجاہد'' کہلاتا ہے۔ باقی دو ساتھی شرجیل اور قیصر شاہ تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی یہ سوداگروں کی جماعت اب حکومتوں کا کاروبار کرنے لگی تھی۔ غاصب فرنگیوں کو شبہ تھا کہ منتشر مسلم باغی گروہ کوہِ شالیہ میں اپنی خفیہ کمین گاہیں بنا سکتے ہیں تاکہ نئے سرے سے اپنی طاقت کو یکجا کر سکیں۔ یوں بھی ان فرنگیوں کا ایک مقصد اپنا ''سلسلۂ تسلط'' کوہِ شالیہ کی ان تینوں قابلِ ذکر ریاستوں تک دراز کرنا بھی تھا۔ لہٰذا مکاری اور دھوکے بازی کا کھیل کھیلتے ہوئے فرنگی حکومت پہلے ریاست ناگرہ کے مہاراجا چندر گپتا کی طرف بہ ظاہر دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہے اور پھر مشترکہ طور پر باقی دو ریاستوں ترپال اور پالن پور کے خلاف عسکری سازش کو عملی جامہ پہناتی ہے تاکہ عسکری کارروائیوں کا آغاز کیا جا سکے۔ ترپال میں مسلم نواب شہباز خان اور پالن پور میں مہاراجا مہندر سنگھ گدی نشین ہوتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے حلیف ہیں۔ راج محل داخلی سازشوں کی زد میں تھا۔ مہارانی نجو بائی اپنے بیٹے ایش کمار کو ولی عہد کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہے مگر پرتاب کمار اس کی راہ کا سب سے بڑا پتھر ہے، جو مہاراجا چندر گپتا کی پہلی اور مرحومہ بیوی کے بطن سے تھا۔ مہارانی نجو بائی کی ایک جواں سال خوبصورت بیٹی سونجا بھی ہے۔ مہارانی اپنے سوتیلے بیٹے ولی عہد پرتاب کمار کو راستے سے ہٹانے اور اپنے بیٹے ایش کمار کا راستہ صاف کرنے کے لیے کالی کے مندر کے مہا پجاری بدری ناتھ کے ساتھ خفیہ گٹھ جوڑ کیے ہوئے ہے۔ بدری ناتھ جس کا اپنا ایک پراسرار اور شیطانی مفاد کالی کے مندر سے وابستہ ہے جو سوائے اس کے اور اس کے سیوک کاروں کے اور کوئی نہیں جانتا۔ بدری ناتھ اپنے پجاریوں کے ذریعے ہنری برنارڈ کو قتل کرا دیتا ہے۔ مہارانی نجو بائی پرتاب کمار کو مارنے کے لیے ایک منصوبے کے تحت اس کے دودھ میں زہر ملوا دیتی ہے۔ تاہم گلاس کی تبدیلی کے بعد زہر ملا دودھ مہاراجا چندر گپتا پی لیتا ہے اور پرتاب کمار کے بجائے وہ موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ پرتاب کمار راجا بن جاتا ہے اور قتل کی تحقیقات کرواتا ہے۔ شک نجو بائی پر ہوتا ہے تاہم پرتاب نجو بائی کو سزا نہیں دیتا مگر اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ ادھر علی ترپال پہنچتا ہے تو اسے پولیس پکڑ لیتی ہے تاہم اپنے بارے میں بتانے پر اور نواب شہباز کا نام لینے پر اسے رعایت دی جاتی ہے۔ علی کے پاس نواب شہباز کے لیے ایک پیغام ہوتا ہے مگر انسپکٹر اسے نواب کے بھائی سراج کے پاس لے جاتا ہے۔ تاہم وہ نواب شہباز سے ملاقات کرنے کا کہہ کر سراج سے اپنی جان چھڑاتا ہے مگر راستے میں کچھ لٹیرے پولیس کی گاڑی کو گھیر لیتے ہیں۔ وہ بڑی مشکل سے ان کے گھیرے سے نکلتا ہے اور نواب شہباز کے پاس پہنچ کر انہیں فرنگیوں کی سازش سے آگاہ کرتا ہے۔ ادھر اریبہ کے ہاتھوں فرنگی افسر بروجر کا قتل ہو جاتا ہے اور اسے قید خانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ شوکی اینڈ کمپنی کے خیموں میں آگ لگ جاتی ہے اور امجد خان، نندو بابا اور شانتا جل کر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ یہ آگ پراسرار بستی کے عجیب و غریب لوگ لگاتے ہیں تاہم رینا انہیں رام کر لیتی ہے اور یقین دلاتی ہے کہ وہ لوگ ان کی مدد کے لیے یہاں آئے ہیں۔ بدری ناتھ ایک انگریز لڑکی کی بلی چڑھا دیتا ہے۔ ماریا کا خنجر ایک لڑکی بالی کے پاس ہوتا ہے جو بدری نارتھ کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ پرس رام اسے سمجھاتا ہے کہ وہ خنجر ان کے لیے مصیبت بن سکتا ہے مگر وہ اس کی بات کو خاطر میں نہیں لاتا۔ راجا پرتاب کمار اریبہ کو بری کر دیتا ہے جس کے باعث وہ انگریزوں سے دشمنی پال لیتا ہے۔ ادھر بچھو رام ماریا کے باپ کرنل اینڈرسن کو خبر دیتا ہے کہ ماریا کے غیاب میں مندر والوں کا ہاتھ ہے۔ انگریز کوہِ شالیہ پر چڑھائی کی منظوری دے دیتے ہیں۔ بدری ناتھ اپنے چیلوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس گوری حسینہ رینا کو اغوا کر لیں۔ دو پجاری رینا کو اغوا کر کے مندر لے آتے ہیں۔ اریبہ اور شاہ زمان سی ہاک نامی جہاز کو تباہ کرنے کے مشن پر روانہ ہوتے ہیں تاہم وہ دھر لیے جاتے ہیں۔ ادھر شوکی رینا کی تلاش میں کالی کے مندر جا پہنچتا ہے۔ وہاں اسے پجاری گھیر لیتے ہیں۔ انگریز بھی وہاں حملہ کر دیتے ہیں۔ شوکی کا مقابلہ بدری ناتھ سے ہوتا ہے۔ شوکی کی مدد ایک نادیدہ قوت کرتی ہے جس کے نتیجے میں کالی کا مندر تباہ ہو جاتا ہے اور شوکی ملبے تلے دب جاتا ہے۔ ادھر

شاہ زمان آزاد ہو کر اریہ کو چھڑانے کی جدوجہد کرتا ہے۔ وہ فرنگیوں کے کیمپ تک پہنچ جاتا ہے اور اریہ کو وہاں سے رہا کروا لیتا ہے۔ ادھر رابرٹ اپنی بہن گارشیا کا گلا دبا کر سونجنا کو راج محل سے بھگا لے جاتا ہے۔ تاہم گارشیا بچ جاتی ہے۔ اس پر قاتلانہ حملے کی وجہ سے راج محل میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ شوکی کو ہوش آتا ہے تو وہ ایک غار میں ہوتا ہے۔ شوکی کے سامنے ایک حسین و جمیل عورت ہوتی ہے جسے دیکھ کر وہ مبہوت ہو جاتا ہے۔ اس کا نام سدھا ہوتا ہے، وہ اس سے مدد کی درخواست کرتی ہے اور اپنی داستان سناتی ہے۔ ادھر شاہ زمان اور اریہ سی ہاک پر پہنچ جاتے ہیں، رینالڈ بھی وہاں پہنچتا ہے اور کیپٹن جیمس اور شاہ زمان کو زخمی کر دیتا ہے۔ رابرٹ سونجنا کو لے کر بذریعہ جہاز انگلستان کے لیے روانہ ہو جاتا ہے۔ ادھر زمان زخمی حالت میں رینالڈ سے مقابلہ کرتا ہے تاہم رینالڈ اریہ کی گولی کا نشانہ بن جاتا ہے۔ سی ہاک وہاں سے روانہ ہو جاتا ہے۔ راج محل میں نجو بائی بچھو رام اور گارشیا کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے کیونکہ راجا کی موت کے بعد وہاں اس کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ ادھر راجا کی طرف سے بھیجے جانے والے چیتن شرما کو جہاز میں سونجنا نظر آ جاتی ہے، وہ راجکماری کو پہچان لیتا ہے۔ سونجنا گھبرا جاتی ہے۔ ریٹا راکاشی بستی سے نکل کر ششکھیر گھاٹی پر آ جاتی ہے۔ وہاں ایک انجانی قوت اسے اپنے زیر اثر کر کے ہپناٹائز کر لیتی ہے۔ ادھر علی اور شاہ زمان وغیرہ ہاؤس بوٹ میں سی ہاک کے تعاقب میں چل پڑتے ہیں، راستے میں ان کا سامنا بحری قزاقوں سے ہو جاتا ہے جو سب کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ علی اور شاہ زمان دو ڈاکوؤں کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں اسی دوران طوفان کے باعث ان کی بوٹ پر ہلچل مچ جاتی ہے۔ ادھر وائٹ فالکن بھی طوفان کی زد میں آ جاتا ہے اور اس کو کافی نقصان پہنچتا ہے۔ کیرتن اور شوبھا اس طوفان میں موت کا شکار بن جاتے ہیں۔ شوکی ریتا کو کھوجتا ہوا ششکھیر گھاٹی پہنچتا ہے۔ بدری ناتھ ریتا کو اپنے شیطانی عمل سے قابو کرنا چاہتا ہے تاہم شوکی اسے بچا لیتا ہے۔ وہ دونوں کوہ شمالیہ سے روانہ ہو کر دلی پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر ہاؤس بوٹ پر شاہ زمان اینڈ کمپنی بحری قزاقوں سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ وہ سب ایک جزیرے پر پہنچ جاتے ہیں اور ڈاکوؤں کو اپنی بوٹ سے اتار دیتے ہیں۔ علی ریحان کو وہاں سی ہاک نظر آ جاتا ہے۔ علی شاہ زمان اور کیپٹن جیمس سی ہاک پر ہلا بول دیتے ہیں تاہم علی اور جیمس پکڑے جاتے ہیں۔ ادھر شوکی ریتا اور اہل خانہ کو لے کر دوسری جگہ ہجرت کرتا ہے اور ریتا سے شادی کر لیتا ہے۔ امپارا علی اور دیگر افراد کو دیکھنے نکلتی ہے مگر وہاں موجود جنگلی اسے پکڑ لیتے ہیں۔ اس کی تلاش میں آنے والی اریہ اور ازابیلا بھی جنگلیوں کے ہتھے چڑھ جاتی ہیں۔ ادھر شاہ زمان، علی اور جیمس کو گرے ہنٹ کی قید سے چھڑا لیتا ہے۔ شوکی ریتا کے ساتھ بمبئی آ جاتا ہے۔ شوکی کے والدین انتقال کر جاتے ہیں۔ وہ اور ریتا نوکری کرنے لگتے ہیں۔ اسی دوران ریتا امید سے ہو جاتی ہے۔ وہ دونوں تانگے پر گھر جا رہے ہوتے ہیں کہ انہیں جوگندر دھمالیہ کے گرگے گھیر لیتے ہیں تاہم شوکی انہیں سبق سکھاتا ہے۔ سی ہاک میں چھپے بیٹھے چری اپا اور بابیلا اپنے سردار کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ علی اینڈ کمپنی گرے ہنٹ سے مقابلے کے بعد سی ہاک پر اپنا قبضہ جما لیتی ہے۔ ادھر سونجنا رابرٹ کو چھوڑ کر پیراڈائز کلب آ جاتی ہے۔ جوگندر دھمالیہ کے گرگے شوکی کے گھر چوری کی واردات کر کے اپنا بدلہ لیتے ہیں۔ ادھر نجو بائی، ایش کمار کو بسنتی کے جال میں پھنسا کر قابو کر لیتی ہے۔ علی ریحان ازابیلا اور اریہ کی تلاش میں جزیرے پر آ جاتا ہے۔ رابرٹ شفیق کو سونجنا کو لانے کے لیے کہتا ہے۔ شفیق پیراڈائز کلب پہنچ جاتا ہے مگر وہاں چیتن شرما رابرٹ کو گھیر لیتا ہے، رابرٹ اسے ٹھکانے لگا دیتا ہے۔ سی ہاک میں موجود چری اپا اور بابیلا جیمس اور زمان پر ہلا بول دیتے ہیں۔ لڑائی میں جیمس مارا جاتا ہے جبکہ چری اپا اور بابیلا بھی کام میں آ جاتے ہیں۔ ادھر علی ریحان کو جنگلی پکڑ لیتے ہیں۔ ازابیلا بھی گرے ہنٹ کے ہاتھوں پکڑی جاتی ہے اور دوبارہ جنگلیوں کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ سونجنا پیراڈائز کلب کو چھوڑ کر کیفے ڈی گولڈ آ جاتی ہے۔ جوگندر دھمالیہ شوکی اور ریتا کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے اور ہر ممکن تعاون کا یقین دلاتا ہے۔ نجو بائی آغا شکلہ کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔ ادھر شوکی اور ریتا کو ٹھکرا اور رگھوناتھ کے گرگے گھیر لیتے ہیں۔ وہ ریتا کی عزت کے درپے ہوتے ہیں کہ وہاں جوگندر دھمالیہ ان کی مدد کو پہنچ جاتا ہے اور سب غنڈوں کی خوب درگت بناتا ہے۔ ادھر ایش کمار بسنتی کو اپنے ساتھ ملا کر نجو بائی سے انتقام لینا چاہتا ہے۔ بسنتی اس کے دام میں آ جاتی ہے۔ رابرٹ کو پولیس گرفتار کر لیتی ہے ادھر سونجنا سے ملنے اشوک کھٹپال آتا ہے۔ اسے دیکھ کر سونجنا پریشان ہو جاتی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

گھاگ اور جہاندیدہ، اشوک کھٹپال کی نظریں سونجنا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی تیز نظروں نے سونجنا کے چہرے کی پریشانی اور فکرمندی کو فوراً تاڑ لیا تھا۔

”ی ی...... یہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟“

بالآخر سونجنا نے سنبھالا لیتے ہوئے ایک نگاہ سامنے کھڑے اشوک پر ڈالتے ہوئے جون میری کی طرف دیکھا۔ اسے جون میری پر بھی شدید غصہ آنے لگا تھا کہ وہ اس سے پوچھے بغیر کیوں ملاقاتی کو فوراً یہاں لے آیا تھا۔

”میرا تو خیال تھا کہ آپ میرے آنے کا مقصد جان گئی ہوں گی......“ اشوک بھی کائیاں شخص تھا۔ اس نے کسی قسم کا لحاظ رکھے بنا ہی بدستور سونجنا کے چہرے پر اپنی نظریں جمائے ہوئے اس سے کہا۔

اس نے بھانپ تو لیا تھا کہ سونجنا کے لیے اس کی آمد غیر متوقع ہی نہیں بلکہ تکلیف دہ بھی ہو سکتی تھی۔ ادھر سونجنا نے بھی اس کے لب و لہجے سے فوراً بھانپ لیا تھا کہ وہ اسے کسی کمزوری کے سبب نفسیاتی دباؤ میں لانا چاہتا ہے، لہٰذا اس

دنیاوی آگ دوسروں کو جلاتی ہے مگر... حسد کی آگ میں انسان خود ہی جلتا بُھنتا رہتا ہے...اور کسی پل قرار نہیں پاتا۔ وہ بھی اپنے مفاد کے حصول میں اتنی گم ہوگئی کہ اپنی خوبیوں کو بھی اس آگ میں جلا ڈالا... اپنے ہی گھر کی بنیادوں کو کھوکھلا کرکے اسے ایک نہ ایک دن بے سائبان تو ہونا ہی تھا۔

خوابوں کے پیچھے بھاگنے والی ایک حسینہ کی نادانیاں

گھر کا بھیدی

آصفہ ضیاء احمد

ساوتری کی نظروں میں اس کا شوہر دینا ناتھ دنیا کا بزدل، ڈرپوک اور بے وقوف آدمی تھا جسے ابھی تک زندگی گزارنے کا سلیقہ نہیں آیا تھا۔اس کی شرافت، ایمانداری و دیانت داری کو بھی وہ اس کی کمزوری اور بزدلی کا نام دیتی تھی۔ ہاں البتہ اپنی دونوں بیٹیوں پر اسے بہت ناز تھا جو اسی کی طرح تیز وطرار اور اڑتی چڑیا کے پر گننے والی تھیں۔ نرملا اور ارملا ماں کی آنکھوں کا تارا تھیں۔ لکھنے پڑھنے میں بھی تیز اور شکل صورت بھی بری نہیں تھیں۔ گریجویشن کرتے

ہی دونوں ملازمت کے لیے گھر سے نکل پڑیں۔ سرکاری ملازمت کا تو جیسے کال پڑا تھا۔ اس لیے وقت اور حالات کو دیکھتے ہوئے دونوں نے ان پرائیویٹ اداروں میں اپلائی کیا جہاں اگر ایمپلائز سے انتھک محنت کروائی جاتی تھی تو روکڑا بھی ٹھیک ٹھاک ہی دیا جاتا تھا۔ دونوں کو روزگار ملتے ہی جیسے گھر میں بہار آگئی۔ روزانہ دال کھاتے کھاتے سارے پریوار کے معدے خراب ہوگئے تھے۔ جب دونوں بہنوں کی پہلی تنخواہ آئی تو گھر میں اچھے کھانوں کی صورت نظر آئی۔ دینا ناتھ کے مدقوق چہرے پر بھی مسکراہٹ آگئی۔ کمزور اور مخنی جسم میں چستی اور توانائی دوڑ گئی۔ دینا ناتھ اپنے آپ کو پھر سے جوان محسوس کرنے لگا۔ کیا ہوا اگر بھگوان نے اسے بیٹا نہیں دیا تھا۔ اس کی بیٹیاں ہی اس کے بیٹے بنے ہوئے تھے۔

اس کی ریٹائرمنٹ اس کے سر پر کھڑی تھی اور وہ اسی فکر میں گھلا جارہا تھا کہ پنشن میں گھر کی گاڑی کس طرح چلے گی لیکن بیٹیوں کو جاب ملتے ہی یہ گاڑی دوڑنے لگی۔ پہلے ہولی دیوالی پر ہی نیا کپڑا نظر آتا تھا لیکن اب دونوں بیٹیاں کبھی ماں کے لیے نئی ساڑی لارہی ہیں تو کبھی باپ کے لیے نئی دھوتی۔ نیم تاریک اور خستہ حال گھر کا رنگ و روغن اپنے منہ سے اپنی شکستگی اور سال خوردگی کی کہانی سنا رہا تھا۔ دونوں بہنوں نے اپنی پس انداز کی ہوئی رقم سے درو دیوار کو کلر کروا کر ٹھیک ٹھاک مرمت کروائی۔ گھر میں پیسا آتے ہی خوشگوار تبدیلیاں بھی آنا شروع ہوگئیں لیکن دونوں میاں بیوی بیٹیوں کی منہ زور جوانیوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں دہلتے رہتے۔ بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر انہیں کھائے جارہی تھی۔ دینا ناتھ تو آفس سے تھکا ہارا آتا اور پڑ کر سو جاتا لیکن ساوتری کی ساری رات آنکھوں میں کٹ جاتی۔ اپنی ذات برادری والوں میں اس نے سب کو کہہ رکھا تھا۔ جان پہچان والوں کے کانوں میں بھی بات ڈال دی تھی لیکن ابھی تک کسی نے دروازہ نہیں کھٹکھٹایا تھا۔ دینا ناتھ شہر کے مختلف میرج بیورو میں بھی دونوں کے نام رجسٹرڈ کروا آیا تھا لیکن کہیں سے معاملہ بارآور ہوتا نظر نہیں آرہا تھا۔ جیسے جیسے وقت بیت رہا تھا، دونوں میاں بیوی کی پریشانی اور تفکرات میں اضافہ ہورہا تھا اور اچانک غیر متوقع طور پر دینا ناتھ کے ایک دوست کے توسط سے ایک فیملی نرملا کو دیکھنے آئی اور لڑکے کی ماں نے جاتے جاتے شگون کے پیسے نرملا کے ہاتھ پر رکھ کر بات پکی کرلی۔ دینا ناتھ اور ساوتری کے مرجھائے اور پژمردہ چہرے کھل اٹھے۔ خود نرملا بھی ساجن کے سپنوں میں ایسی گم ہوئی کہ اپنی سدھ بدھ ہی کھو بیٹھی۔ دونوں خاندانوں نے پنڈت پروہت سے پوچھ کر فوراً ہی شادی کا مہورت بھی نکلوالیا۔ دینا ناتھ نے اپنی ساری زندگی کی بچت نرملا کی شادی میں لگادی اور جب وہ رخصت ہوکر سدھاری تو دینا ناتھ اور ساوتری کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ ہلکے پھلکے ہوکر آسمانوں میں پرواز کررہے ہوں۔

☆☆☆

ستیش اور سنتوش کی ماں بملا ٹھاکر کافی رکھ رکھاؤ والی پڑھی لکھی اور خوش مزاج عورت تھی۔ اپنے شوہر کی موت کے بعد اس نے اپنے دونوں بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت نہایت جانفشانی اور تندہی سے کی۔ بڑا بیٹا ستیش ایک اہم سرکاری عہدے پر فائز تھا۔ طویل القامت، خوبرو ستیش کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں تھی لیکن اپنی آئیڈیل پرستی کی وجہ سے وہ ابھی تک کنوارا تھا۔ بملا نے بہت چاہا کہ پہلے بڑے بیٹے کو لگن منڈپ میں بٹھائے لیکن ستیش کو ابھی تک اپنی پسند کی لڑکی ہی نہیں مل پائی تھی۔ اس لیے تھک ہار کر اس نے اپنے چھوٹے بیٹے سنتوش ٹھاکر کا رشتہ دینا ناتھ کی بڑی بیٹی نرملا سے طے کردیا۔ نرملا تھی تو ایک عام سی لڑکی، سانولی سلونی، تعلیم یافتہ...... گُن ڈھنگ بھی اچھے تھے۔ رسوئی کے کام بھی اتنے تو کرلیتی تھی کہ اپنے پریوار کو پیس پکا کر کھلا سکے۔ ہاں البتہ دولت کی چمک دمک اس کے پاس نہیں تھی لیکن بملا نے بھی اپنی سوچ کے گھوڑے دوڑائے کہ اگر امیر اور اونچے گھرانے میں سنتوش کا رشتہ لے جاتی ہے تو لڑکی والے جو پوچھ کچھ کریں گے، اس کے جوابات نہ وہ دے سکے گی اور نہ اس کا بیٹا کیونکہ بڑا بیٹا ستیش جتنا ذہین، ایکٹیو اور ہونہار تھا، سنتوش اتنا ہی غبی، سست اور کاہل تھا۔ انٹر کا امتحان بھی تھرڈ ڈویژن میں پاس کیا تھا۔ دو تین کمپیوٹر کورس کرنے کے بعد ستیش نے اپنے تعلقات اور سورسز (Sources) استعمال کرتے ہوئے ایک مالیاتی ادارے میں اسے کلرکی دلوادی جو اس نے خوشی خوشی قبول بھی کرلی۔ ترقی اور آگے بڑھنے کا اس میں جوش تھا نہ جذبہ۔ جو کماتا اس کا پچاس فیصد ماں کے ہاتھ پر رکھ دیتا اور باقی پیسا اپنے اخراجات کے لیے رکھ لیتا۔ بملا نے سنتوش کا پیسا کبھی استعمال نہیں کیا۔ اسے اچھی طرح علم تھا کہ اس کی واجبی سی آمدنی ہے۔ اس لیے اس کا پیسا ہمیشہ پیچھے ڈال دیا تاکہ اس کے برے وقت میں وہ پیسا اس کے کام آئے۔ نرملا سے بات طے کرنے کے بعد بملا نے اسی پیسے سے آنے والی بہو کے لیے کپڑے گہنے خریدے تو آنے والے براتیوں

انوکھا بلیک میلر

ایم الیاس

ناکامیوں سے دلبرداشتہ ہو کر غیر حقیقی اداکاری کرنے والا ایک دن کامیاب اداکار بن ہی گیا کیونکہ... اسے بے رنگ خاکے میں حقیقی رنگ بھرنے کا ہنر آگیا تھا لیکن... اس دوران وہ جس اذیت سے گزر رہا تھا اس نے اپنے سائے کو بھی اس کا احساس نہ ہونے دیا پھر کیسے وہ لوگ اس سے آگاہ ہوسکتے تھے جو مسلسل ایک غلطی کی وجہ سے بلیک میل ہورہے تھے۔

انوکھا طریقہ اور انوکھی واردات کا سنسنی خیز ماجرا

نیو ماڈرن باربر شاپ میں ایک نیا گاہک داخل ہوا تو نارائن دیوان فوراً ہی اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ جب کبھی اس کی دکان میں نیا گاہک داخل ہوتا تو وہ اسے اوپر سے نیچے تک ناقدانہ نظروں سے ضرور دیکھتا۔ اس کے اندازے کے مطابق آنے والے اس نئے گاہک کی عمر چھیالیس برس تھی۔ اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ کسی بیماری میں مبتلا ہے۔ اس کے چہرے پر نیلاہٹ تھی۔ نارائن دیوان پر کوئی اچھا تاثر قائم نہیں ہوا لیکن چونکہ باربر کا پیشہ

اخلاق طلب ہوتا ہے۔ وہ ایک باتونی شخص واقع ہوا تھا اور ایک طرح سے بات کرنے کا شوق پیشے کے اعتبار سے ضروری بھی تھا۔ اس نے گاہک کا پیشہ ورانہ سواگت کیا جیسے وہ کوئی معزز مہمان ہو۔

گاہک نے نارائن دیوان پر ایک طویل اور گہری نگاہ ڈالی اور کچھ کہے بغیر آئینے کے سامنے ایک کرسی پر براجمان ہوگیا۔ پھر اس نے دھیمے انداز میں جماہی لی جیسے اسے نیند آرہی ہو اور وہ رات بھر کا جاگا ہوا ہو۔

نارائن کے تجربے اور اندازے کے مطابق وہ ان گاہکوں میں سے تھا جو اس کی دکان میں داخل ہوتے ہی اونگھنے لگتے ہیں۔ اس کے سخت خاکستری بال پانی سے نرم اور ہموار کرتے ہوئے نارائن نے پوچھا۔

''کیا آپ مانگ نکالنا پسند کریں گے؟''

اجنبی نے آنکھیں بند کیے ہوئے گردن کی ہلکی سی جنبش سے اثبات میں جواب دیا۔

نارائن کے اندر فطری تجسس سا بیدار ہوگیا۔ اس نے غور سے دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ اس گاہک کی آنکھوں کے حلقے ایک غیر متوازن اور پریشان کن زندگی کو ظاہر کرتے تھے۔ 'بھگوان جانے یہ کیا کام کرتا ہے؟' اس نے گاہک کا جائزہ لینے کے بعد قینچی چلائی۔ اس کی یہ بہت بڑی کمزوری تھی کہ وہ کسی طرح گاہکوں کے پیشے کا اندازہ کرے۔ عموماً اس کے اندازے بالکل صحیح ثابت ہوتے تھے جیسے کسی اچھے ماہر نشانے باز کا نشانہ ہدف پر لگتا ہے لیکن اس آدمی نے اسے چکرا دیا تھا۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ تین بج رہے تھے۔ نارائن نے سوچا کہ اگر یہ شخص کہیں عام قسم کا ملازم ہوتا تو اس کا یہ وقت دفتر میں گزرتا۔ اگر کسی دکان میں سیلز مین ہوتا تو چہرے مہرے سے سنجیدہ دکھائی دیتا۔ نارائن آس پاس کی دکانوں میں کام کرنے والے تمام ملازمین سے خوب آشنا تھا لیکن اسے اس گاہک کے پیشے کا صحیح اندازہ نہ ہوسکا۔ اس کے متعلق کچھ جاننے کے اشتیاق نے اسے بے چین اور مضطرب کردیا تو اس نے ایک عام سا موضوع چھیڑ دیا۔

''سہ پہر ڈھلنے لگی ہے لیکن اس کے باوجود گرمی کی شدت میں کوئی کمی نہیں آرہی ہے۔''

''ہاں۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا لیکن اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔

''مجھے یاد نہیں آرہا کہ آپ پہلے بھی میری دکان پر آئے ہوں۔ کیا آپ کہیں پاس ہی رہتے ہیں؟''

''ہوسکتا ہے۔'' اجنبی نے قدرے تامل سے کہا۔ اس کے لہجے میں ناخوشگواری سی تھی۔

نارائن نے گلا صاف کیا۔ ''آپ کو یہ بتانے میں میرے خیال میں کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ آپ کیا کرتے ہیں؟ آپ کا پیشہ کیا ہے؟''

''میرا پیشہ؟''

''جی۔''

''تمہارا کیا خیال ہے...... کیا ہوسکتا ہے؟''

''آپ کا پیشہ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ ویسے اکثر میں اپنے کرم فرماؤں کے پیشے پہچان لیتا ہوں۔''

''واقعی؟'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہوسکتا ہے کہ آپ کسی بار میں ملازم ہوں یا ممکن ہے کوئی دوسرا کام کرتے ہوں۔''

''نہیں...... مگر میرا پیشہ تمہیں جلد معلوم ہوجائے گا۔ میں اب اکثر یہاں آتا رہوں گا۔''

''یہ آپ کی بڑی دیا ہوگی۔'' نارائن دیوان نے جھک کر کہا۔

شیمپو سے سر دھو کر گرم تولیے سے اس نے گاہک کا چہرہ ڈھانپ دیا۔ بھاپ دینے کے بعد صابن لگانے کی باری آئی تو گاہک نے آنکھیں کھولے بغیر پوچھا۔ ''کیا تم تنہا دکان چلاتے ہو؟''

نارائن دیوان نے سوچا کہ یہ شخص تو خود ہی بات کرنے پر آمادہ ہوگیا ہے لہٰذا اسے بھی سوالات کرنے کا موقع مل جائے گا۔ اس نے اس لمحے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

''میں اور میری پتنی مل کر یہ دکان چلاتے ہیں۔ وہ بچوں اور عورتوں کے بال کاٹتی ہے۔ وہ آج نہیں آئی ہے کیونکہ بچی کے ساتھ ایک رشتے دار کی بچی کی سالگرہ پارٹی میں گئی ہوئی ہے۔''

''تم اور تمہاری بیوی؟'' اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''جی ہاں......'' نارائن دیوان نے کندھے اچکائے اور پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے جواب دیا اور استرا اٹھایا۔ اس نے گاہک کے چہرے کی کھال آہستہ سے انگلیوں سے دبائی۔ جھریوں کی کھردراہٹ کی وجہ سے شیو بنانا مشکل تھا۔ ''کیا آپ کی بھویں بھی بنا دوں؟''

اس شخص نے اثبات میں سر ہلایا اور آنکھیں کھول کر نارائن پر نظریں گاڑ دیں پھر بولا۔

''تمہارا پورا نام نارائن دیوان مکرجی ہے نا؟''

میں ایک قلم کار ہوں اور کتابیں، بالخصوص ناول لکھنا میرا پیشہ ہے۔ یہی میرا روزگار ہے اور اس کی آمدنی سے میرا گزارہ ہوتا ہے۔ میں عام طور پر ناول لکھنے کو ترجیح دیتا ہوں کیونکہ ان کے پڑھنے والوں کا حلقہ بہت وسیع ہے اور اگر کوئی ناول زیادہ تعداد میں فروخت ہوجائے تو معاوضے کے علاوہ اس کی رائلٹی بھی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر ناولوں کے درمیان وقفہ آجائے، کوئی اچھوتا خیال نہ سوجھ رہا ہو اور بینک میں پیسے تیزی سے ختم ہوتے جارہے ہوں تو میں کسی کی آپ بیتی یا سوانح حیات لکھنا شروع کردیتا ہوں۔ یہ پیسے کمانے کا آسان طریقہ ہے اور اس میں زیادہ وقت بھی نہیں لگتا۔ میں اسے افسانوی انداز میں لکھتا ہوں اور میری کوشش ہوتی ہے کہ اس میں سنسنی خیزی کا عنصر برقرار رہے تاکہ زندگی کی آزمائشوں سے تنگ آئے ہوئے قارئین اپنی بوریت دور کرسکیں۔

میرے سامنے سپر اسٹار کی مثال ہے۔ اسپینسر جونز کی یہ داستانِ حیات میں نے چند برس قبل لکھی تھی۔ وہ سلور اسکرین کا سدابہار ہیرو تھا۔ مرد اسے اس لیے پسند کرتے کہ وہ فلم کے پردے پر ناقابلِ یقین کارنامے انجام دیتا۔ اگر کسی کی زندگی، ملک یا براعظم خطرے میں ہوتا تو وہ تحفظ کے لیے اسی کی طرف دیکھتے کیونکہ اس میں شیطانی قوتوں کا

عجیب مگر کچھ چند دنوں کی محبت کا ایک خوب صورت نذرانہ

کچھ بڑے لوگوں کو اپنی سوانح حیات لکھوانے کا بہت شوق ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی کچھ ناپسندیدہ پہلوئوں کو چھپانا بھی چاہتے ہیں پھر بھلا وہ مکمل حیات کا احاطہ تو نہ ہو مگر کیا کریں کہ وہ ایسا ہی چاہتے ہیں۔ یہاں بھی جب اس لکھاری نے اس کی ادھوری حیات کو قلمبند کرنے سے انکار کیا تو اس پر زندگی کا دائرہ تنگ کردیا گیا اور پھر وہ کچھ ہو گیا جس کا کسی کو گمان تک نہ تھا۔

شناسا اجنبی

شاہ زین رضوان

مقابلہ کرنے کی صلاحیت تھی۔ عورتیں بھی اس پر فدا تھیں۔ وہ لیڈیز مین کہلاتا تھا اور ہمیشہ ایسی خوب صورت لڑکیوں کی تلاش میں رہتا جنہیں وہ اپنے بستر کی زینت بنا سکے۔

میں نے اسپینسر کی حقیقی زندگی کو دنیا کے سامنے عیاں کردیا اور اس کی وہ تصویر دکھائی جو لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھی۔ درحقیقت وہ ایک دبو اور خانہ نشین شخص تھا جو عوام کی نظروں سے بہت دور سان فرنانڈو کی وادی میں رہتا تھا۔ اس کی بیوی اس پر پوری طرح غالب تھی اور وہ اس سے خوفزدہ رہتا تھا تاہم اپنے نو بچوں کے لیے وہ ایک مشفق باپ تھا جن میں تین لے پالک تھے۔ میرا مطلب ہے کہ بہت سے لوگوں کی زندگی میں اس طرح کے تضادات پائے جاتے ہیں اگر قارئین دس پندرہ ڈالرز خرچ کرکے ان کے بارے میں پڑھ لیں تو وہ اسپینسر جونز کے سحر سے آزاد ہوسکتے ہیں جسے وہ جانتے اور اس کی فلموں کو پسند کرتے ہیں۔

میں نے دوسرے فلم اسٹارز کے بارے میں بھی اسی طرح کے حقائق بیان کیے ہیں۔ اس میں مرد اور عورت کی کوئی تخصیص نہیں۔ اس کے علاوہ ایک ٹی وی نیوز اینکر، باسکٹ بال کا کھلاڑی، اولمپک گولڈ میڈلسٹ اور ایک بیڈ بوائے امیج رکھنے والا راک اسٹار بھی اس فہرست میں شامل ہے۔ اب آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے لہٰذا تفصیلات میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا بلکہ میں انہیں اپنی خودنوشت سوانح حیات کے لیے بچا کر رکھوں گا۔ فی الوقت میں جو داستان سنا رہا ہوں، اس کا عنوان ہے ''جھوٹ اور دوسرے سچ۔''

یہ ایک نامی گرامی اور بہت بڑے شوبزنس ٹیلنٹ ایجنٹ کی کہانی ہے جو آرنلڈ سینڈرز کے نام سے پہچانا جاتا ہے اور اگر ایجنٹ کی بات کی جائے تو ہالی وڈ میں اس سے زیادہ اہم شخص کوئی نہیں ہے۔ وہ کی اسٹون ٹیلنٹ انٹرنیشنل کا سربراہ ہے۔ یہ سات سال پہلے وجود میں آئی اور تبھی سے اس کا شمار چوٹی کی ایجنسی میں ہوتا ہے۔

سینڈرز نے یہ مقام بہت کم وقت میں حاصل کیا۔ اس نے ایک کمرے سے اپنا سفر شروع کیا تھا اور تیزی سے آگے بڑھتا ہوا مین اسٹریٹ پر واقع ایگزیکٹو سویٹ تک پہنچ گیا۔ اس نے بلندی کی جانب بے مثال چھلانگ لگائی اور دیکھتے ہی دیکھتے صف اول کا ایجنٹ بن گیا۔

اس روز میں سینڈرز کے بلاوے پر اس کے دفتر جا رہا تھا۔ اپنی رہائش گاہ سے کی اسٹون ٹاور کی بارھویں منزل پر واقع اس کے شاندار سویٹ کی طرف جاتے ہوئے یہی خوف ستا رہا تھا کہ استقبالیہ ڈیسک سے یہ نہ کہہ دیا جائے......

''معاف کرنا۔ مسٹر سینڈرز سے تمہاری ملاقات منسوخ کردی گئی ہے۔ ہم تمہیں بتا دیں گے کہ یہ ملاقات کب ہوگی۔'' اس کی کوئی وجہ نہیں بتائی جاتی۔ بس مسکراتے ہوئے خدا حافظ کہہ دیا جاتا۔ ساتھ ہی یہ تاکید بھی ہوتی کہ ہمیں فون کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم خود تمہیں مطلع کردیں گے۔

میں اس صورتِ حال کا سامنا کرنے والا پہلا شخص نہ ہوتا اور نہ ہی آخری۔ سینڈرز صرف اپنی پسند کے لوگوں کو بالمشافہ ملاقات کی اجازت دیتا تھا۔ اس کا کوئی اسسٹنٹ فون کرکے دعوت نامہ بھیج دیتا جس پر تاریخ اور وقت درج ہوتا تھا۔ اس پر کوئی بات نہیں ہوسکتی۔ آپ کے پاس صرف ہاں یا نہ کی گنجائش ہے اور اگر آپ نے انکار کردیا تو سمجھ لیں کہ اس کے بعد سینڈرز سے ملاقات کا کوئی امکان نہیں رہے گا۔

لیکن میرے تمام اندیشے بے بنیاد ثابت ہوئے جب استقبالیہ ڈیسک پر بیٹھی اس حسین قتالہ نے کہا۔ ''تم وقت پر آئے ہو۔'' اس نے قیمتی لباس زیبِ تن کر رکھا تھا جو اس کے دلکش جسمانی خطوط کو چھپانے کے لیے ناکافی تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی جاندار مسکراہٹ تھی۔ وہ سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ''مجھے ڈر تھا کہ اگر ایک منٹ کی بھی تاخیر ہوگئی تو تمہیں واپس بھیجنا ہوگا۔''

اس نے سینڈرز کی پرائیویٹ لفٹ کی طرف اشارہ کیا جو مجھے لے کر سیدھی بارھویں منزل پر پہنچ گئی جہاں سینڈرز کے ایک مرد خدمت گار نے مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ ''تم وقت پر آئے ہو۔'' اس نے کہا اور مجھے لے کر تیزی سے ان میزوں کی طرف بڑھا جہاں دو سیکریٹریز بیٹھی ہوئی تھیں اور سینڈرز کے کمرے میں داخل ہوگیا۔

وہ ایک وسیع و عریض کمرا تھا جس کی سجاوٹ بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ وہاں مجھے قدیم اور جدید اشیاء کا حسین امتزاج نظر آیا جن میں قیمتی فرنیچر، پینٹنگز اور دیگر آرائشی اشیاء شامل تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ پُرکشش پکاسو کی بنائی ہوئی آئل پینٹنگ تھی۔

سینڈرز اپنی میز کے پیچھے کھڑا ہوا تھا جو کسی کاریگر کے ہاتھوں کا بنا ہوا انتہائی نفیس شاہکار تھی۔ اس کی پشت میری جانب تھی اور وہ ایک سنیما اسکوپ سائز کی کھڑکی سے افق کے پار دیکھ رہا تھا۔

وہ میری طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ''تم وقت پر آئے ہو۔'' پھر اس نے ملاقاتیوں کے لیے مخصوص کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود ایک شاہانہ کرسی پر بیٹھ گیا جو کسی بادشاہ کے لیے موزوں تھی۔ اسے بجا طور پر خوش شکل کہا جاسکتا تھا۔ وہ کئی ایسے فلم اسٹارز سے زیادہ خوبصورت تھا

بند گلی

ملک صفدر حیات

کمزور لمحات میں ہر انسان کو سہاروں کی ضرورت پڑتی ہے اور ایسے میں دل کو کسی کا اچھا لگ جانا بھی ایک بے اختیار جذبہ ہے... وہ بھی بے سہارا تھا اور دل کے ہاتھوں مجبور بھی... لہٰذا بھٹکے ہوئے مسافر کے مانند بند گلی میں راستہ تلاش کررہا تھا مگر افسوس... اس کی سچائی، خلوص اور جدوجہد پتھر کی دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر موت کی نیند سو گئے کیونکہ اسے معلوم نہ تھا کہ ایک دن یہ خوب صورت جذبہ اسے بھیڑیوں کے سامنے لا کھڑا کرے گا۔

قانون کے سامنے خونی بھیڑیوں کی حقیقت کھولنے والے ملک صاحب کا کارنامہ

بعض اوقات انسان کا ذہن بہ یک وقت ایک ہی نوعیت کے مختلف معاملات میں الجھ کر اس قدر خجل خوار ہو چکا ہوتا ہے کہ مسائل کے حل کے لیے اسے کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی بند گلی میں پہنچ ہو گیا ہو۔ زیرِ نظر کہانی کے ایک موڑ پر میں بھی ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار ہو گیا تھا۔

ان دنوں میرے بیوی بچے مجھ سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ تھانے کے عقبی حصے میں بنا ہوا سرکاری کوارٹر کسی فیملی کی رہائش کے اعتبار سے اگرچہ بہت ہی چھوٹا تھا لیکن وہ لوگ چند روزہ قیام کے لیے آئے تھے، اس لیے جیسے تیسے گزارہ ہو رہا تھا۔

وہ ماہِ جولائی کے آخری ایام تھے۔ ساون کا مہینا اپنے جوبن پر تھا۔ ایک صبح میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو ایک افسوس ناک خبر میری منتظر تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ ماسٹر خلیل کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ میں نے کانسٹیبل کو اپنے ساتھ لیا اور جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔

ماسٹر خلیل کا تعلق موضع سلطان آباد سے تھا۔ وہ گاؤں کے اکلوتے پرائمری اسکول میں پڑھاتا تھا۔ موضع سلطان آباد میرے تھانے کے جنوب میں لگ بھگ دو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ یہ کم و بیش تین سو گھروں پر مشتمل ایک گنجان آباد گاؤں تھا۔ میں تانگے پر سوار ہو کر چند منٹ میں وہاں پہنچ گیا تھا۔

گاؤں کے اندر داخل ہوتے ہی مجھے پتا چل گیا کہ ماسٹر خلیل کی لاش ظہوری باغ میں پڑی ہے۔ مذکورہ باغ گاؤں اور نہر کے درمیان کھیتوں کے بیچوں بیچ واقع تھا۔ یہ ایک خاصا وسیع و عریض باغ تھا جس میں آم، انار، جامن، امرود اور کینو کے درختوں کی بہتات تھی۔ آج کل آم اور جامن کے پیڑ پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ یہ باغ

چودھری سلطان نے اپنی بیوی ظہورہ بیگم کی خواہش پر لگایا تھا اسی لیے ''ظہوری باغ'' کے نام سے مشہور تھا۔ ان دنوں چودھری سلطان کا پوتا اس گاؤں کا حاکم تھا جس کا نام چودھری نظام تھا۔

میں نے زمین پر اکڑوں بیٹھ کر ماسٹر خلیل کی لاش کا... بغور معائنہ کیا۔ وہ اوندھے منہ باغ کی گھاس دار زمین پر پڑا تھا۔ ماسٹر خلیل کی عمر کا اندازہ میں نے تیس کے قریب لگایا۔ وہ گھنگرالے بالوں والا ایک صحت منداور خوب رو مرد تھا۔ اس کا قد میانہ اور رنگت گندمی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ ماسٹر خلیل کے سر پر لاٹھیوں کے پے در پے وار کر کے اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ مقتول کی کھوپڑی کئی جگہ سے پھٹی ہوئی تھی جس میں سے خارج ہونے والے خون نے ماسٹر خلیل کے چہرے اور لباس کو بری طرح داغ دار کر رکھا تھا۔ اس کے سر کے بالوں میں بھی خون جما ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی لاش کے نزدیک گھاس کا کچھ حصہ بھی خون آلود تھا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ماسٹر خلیل کو دارِ فانی سے رخصت ہوئے دو سے چار گھنٹے کا وقت گزر چکا تھا۔ باغ کی گھاس دار زمین خاصی گیلی ہو رہی تھی جس کی وجہ سے مقتول ماسٹر خلیل کا لباس بھی کئی جگہ سے خراب ہو چکا تھا۔

میں نے ماسٹر خلیل کی لاش کو سیدھا کرنے کے بعد جسم کے دیگر اعضاء کا تفصیلی جائزہ لیا تو پتا چلا کہ اس کے ہاتھوں، بازوؤں اور کندھوں پر بھی لاٹھیوں کی ضربات کے واضح نشانات موجود تھے۔ یہی حال اس کی کمر کا بھی تھا۔ اغلب امکان اسی بات کا تھا کہ حملہ آور ایک سے زیادہ تھے اور انہوں نے لاٹھیوں کے خوف ناک وار کر کے ماسٹر خلیل کو زندگی کی قید سے آزاد کر دیا تھا۔ اس دوران میں ماسٹر خلیل نے خود کو بچانے کی بھرپور کوشش کی تھی جس کے نتیجے میں وہ اپنی جان کو سلامتی تو نہ دے سکا تاہم اس کے ہاتھ اور بازو بری طرح زخمی ہو گئے۔ حملہ آور جو کوئی بھی تھے، وہ ماسٹر خلیل کے لیے اپنے دل و دماغ میں بے پناہ نفرت اور غصہ رکھتے تھے۔ یہ ایک سیدھی سادی انتقامی کارروائی تھی جس میں ماسٹر خلیل اپنی زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔

موقع پر کم و بیش دو درجن افراد موجود تھے جن میں مرد و زن اور بچے بھی شامل تھے۔ ان سب کا تعلق موضع سلطان آباد ہی سے تھا۔ لاش کا میں تفصیلی معائنہ کر چکا تھا۔ آئندہ آدھے گھنٹے میں، میں نے جائے وقوعہ کا بھی تنقیدی جائزہ لے ڈالا اور اس سعی میں ایک کام کی چیز میرے ہتھے لگ گئی۔

وہ پیتل کی بنی ہوئی ایک شام تھی۔ ایسی شامیں عموماً لاٹھیوں کے سروں پر چڑھائی جاتی ہیں تاکہ ان کی مضبوطی میں اضافہ ہو۔ ''شام'' ایک طرح کا دھاتی خول سمجھ لیں۔ زیادہ تر یہ خول پیتل کے پترے سے تیار کیا جاتا ہے۔ اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں تھی کہ ماسٹر خلیل کی لاش کے نزدیک سے ملنے والی وہ ''شام'' حملہ آوروں کی کسی لاٹھی ہی سے نکل کر وہاں گری ہوگی۔ جائے وقوعہ کے جائزے میں کانسٹیبل خاور بھی میرا ساتھ دے رہا تھا۔ جب یہ کام مکمل ہو گیا تو میں نے کانسٹیبل کو اپنے پاس بلا کر کہا۔

''خاور! تم ماسٹر خلیل کی لاش کو ڈسٹرکٹ اسپتال لے جاؤ تاکہ اس کا پوسٹ مارٹم ہو سکے۔''

''ملک صاحب! لاش کو اسی تانگے میں لے کر جانا ہے؟'' اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

''ہاں!'' میں نے اس کے سوال کے مفہوم کو سمجھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''میں اپنی واپسی کا بندوبست خود کر لوں گا اور ہاں......'' لحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''تم ضلعی اسپتال جاتے ہوئے راستے میں تھانے کو ضرور ٹچ کر لینا۔ مجھے جائے وقوعہ پر فیض علی کی ضرورت ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

فیض علی کا تعلق محکمۂ پولیس سے باقاعدہ طور پر نہیں تھا۔ مطلب یہ کہ وہ محکمے میں ملازم نہیں تھا لیکن ضرورت پڑنے پر وہ اپنی خدمات سے الجھے ہوئے معاملات کو سلجھانے میں کافی مددگار ثابت ہوتا تھا۔

فیض علی بنیادی طور پر ایک عمر رسیدہ اور تجربہ کار کھوجی تھا۔ میں نے بعض کیسوں میں فیض علی کو حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین کارکردگی کا مظاہرہ کرتے دیکھا تھا۔ کانسٹیبل خاور نے میرے استفسار کے جواب میں کہا۔

''چنگی طراں سمجھ رہا ہوں ملک صاحب!''

ماسٹر خلیل کی زخموں سے چُور لاش کو تانگے پر لدوا کر وہاں سے روانہ کرنے کے بعد میں جائے واردات پر موجود افراد کی جانب متوجہ ہوا تو ایک ادھیڑ عمر عورت میرے نزدیک آ گئی۔ اس نے گلوگیر آواز میں اپنا تعارف کراتے ہوئے مجھ سے کہا۔

''تھانے دار صاحب! میرا نام فردوس بی بی ہے۔ میں خلیل کی ماں ہوں۔ پتا نہیں، کس ظالم نے میرے بیٹے کو دشمنی کا نشانہ بنایا ہے؟''

فردوس بی بی کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وہ بھاری

چراغ کی خوبی یہ ہے کہ گہری تاریکی میں دور تک روشنی دیتا ہے مگر...بدقسمتی سے اپنے گرد اندھیرے کا ہالہ بنا لیتا ہے...وہ بھی ایک ایسا ہی بدقسمت باپ تھا جو دوسروں کی خوشیوں میں شریک رہتا مگر اپنے گھر خوشیوں کا رستہ تکتے تکتے بالآخر موت کے فرشتے کو بلا بیٹھا۔

"چراغ تلے اندھیرا" کی افسوس ناک تفسیر

چراغ تلے

منظر امام

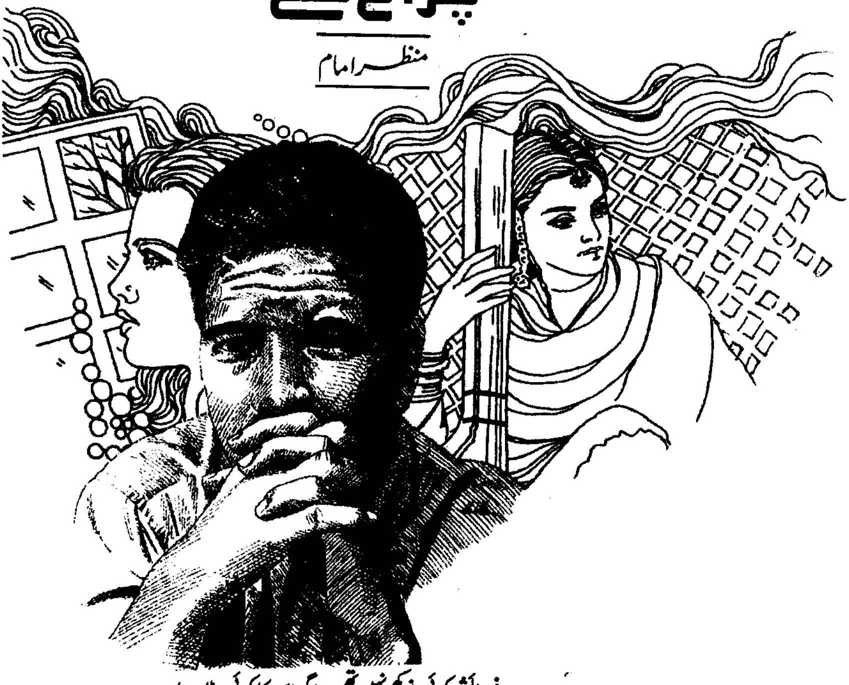

وہ فرمائش کوئی انوکھی نہیں تھی۔ اگر اس کا کوئی بیٹا ہوتا اور وہ ایسی فرمائش کرتا تو شاید وہ خوش ہو کر اسے گلے لگا لیتا لیکن زرینہ ایک لڑکی تھی۔ لڑکی سے ایسی فرمائش اسے کچھ اچھی نہیں لگی۔ وہ اسے گھور کر رہ گیا۔

زرینہ نے کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کیا پھر وہ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ کبیر رات کا کھانا اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ وہ عام طور پر رات کا کھانا ساتھ ہی لایا کرتا تھا۔ باورچی خانے سے برتنوں کے کھڑکنے کی آوازیں آنے لگیں۔

زرینہ اس کا لایا ہوا کھانا برتنوں میں نکال رہی تھی۔
کچھ شیر مال تھے۔ ایک بڑے سے شاپر میں بریانی تھی۔ ایک دوسرے شاپر میں قورمہ تھا اور ایک شاپر میں کسٹرڈ بھی تھا۔ یہ ان کا روز کا کھانا ہوا کرتا۔ کبیر کو یاد تھا کہ مرنے والی کو اس قسم کا کھانا کتنا پسند تھا۔ وہ کہا کرتی تھی۔ ''کبیرے! اللہ کا شکر ادا کر۔ ہم جیسا کھانا روز کھاتے ہیں، ویسا تو امیر لوگ بھی نہیں کھاتے ہوں گے۔''
وہ ٹھیک ہی کہتی تھی لیکن یہ صرف کبیر جانتا تھا کہ اس قسم کا کھانا لانے میں اس کی عزتِ نفس کو کتنی جھڑکیاں ملتی تھیں۔
وہ ایک بینڈ ماسٹر تھا۔ کئی لوگ تھے اس کے ساتھ جو مختلف ساز بجایا کرتے۔ کسی کے پاس ڈرم تھا۔ کوئی بانسری بجاتا تھا۔ کوئی جھانجن بجاتا تھا جبکہ کبیر کلارنٹ بجاتا تھا۔ یہ ایک مشکل ساز تھا لیکن کبیر بہت عمدہ کلارنٹ بجاتا تھا۔
خدا بھلا کرے استاد دل گیر کا...... جس نے اسے یہ ہنر سکھا دیا تھا۔ اس کا باپ ایک کارخانے میں کام کرتا تھا۔ عام سا مزدور۔ اس کی ماں بھی ایک عام سی عورت تھی۔ وہ بس عام سے لوگ تھے۔ ایسے لوگوں کی زندگی ایک ہی جیسی ہوتی ہے۔ کوئی تبدیلی نہیں، کوئی بڑی خوشی نہیں۔ بس چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہوتی ہیں جن کو وہ بہت بڑی نعمت جان کر گلے سے لگا لیتے ہیں۔
کبیر جس محلے میں رہتا تھا اس محلے کی ایک دکان میں استاد دل گیر کی بینڈ کمپنی تھی۔ کبیر کو ان لوگوں کی وردی بہت اچھی لگتی تھی۔ جب وہ سب کسی وقت پریکٹس کرتے تو کبیر کو بہت اچھا لگتا۔
کبیر اپنے ابا کی نظر بچا کر دل گیر بینڈ کے پاس پہنچ جاتا۔ اسے یہ سب بہت اچھا لگتا تھا۔ سب کا وردی پہن کر ایک لائن میں کھڑے ہو کر مختلف فلمی دھنیں بجانا۔ بانسری کی آواز اور کلارنٹ کے سُر اسے بہت متاثر کرتے تھے۔ اس کے ابا نے اسے ایک سرکاری اسکول میں ڈلوا دیا تھا۔ اس کی تعلیم جیسے تیسے چل رہی تھی لیکن پڑھنے لکھنے میں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔
کبیر کے باپ نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ ویسے بھی وہ جانتا تھا کہ پڑھ لکھ کر کبیر کوئی بابو تو بن نہیں سکتا۔
ایک دن استاد دل گیر نے اس کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے اسے کلارنٹ کا سبق دینا شروع کر دیا۔ اس نے محسوس کر لیا کہ اس لڑکے کے اندر ایک اداکار چھپا ہوا ہے۔ اس نے بہت چاؤ سے کبیر کو کلارنٹ کی نہ صرف تعلیم دینی شروع کر دی بلکہ کبیر کے باپ کو بھی بتا دیا کہ وہ کبیر کو اس کی شاگردی میں دے دے۔ کچھ دنوں کی ٹریننگ کے بعد وہ کبیر کو اپنی بینڈ پارٹی میں رکھ لے گا۔ اس طرح کبیر کی زندگی کی راہ متعین ہو گئی۔
اس نے کلارنٹ بجانا شروع کر دیا۔ بہت جلد اس کی دھوم مچ گئی۔ شادی بیاہ میں لوگوں کی یہ خواہش ہونے لگی کہ برات میں استاد دل گیر ہی کی پارٹی آیا کرے۔ کبیر کی وجہ سے استاد کا کاروبار بھی چمک اٹھا تھا۔
پہلے تو کبیر کے باپ کا انتقال ہوا پھر استاد بھی مر گئے۔ ان کی موت کے بعد بینڈ پارٹی کبیر کے ہاتھ میں آ گئی۔ وہ بینڈ ماسٹر بن گیا۔ رزق کا ایک ذریعہ پیدا ہو گیا تھا۔ زرینہ نے کھانا اس کے سامنے لا کر رکھ دیا۔
کبیر کے خیالات کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد کی کہانی بہت سیدھی سی تھی۔ کبیر کی شادی خاندان ہی کی ایک لڑکی سے ہو گئی۔ زندگی کسی طور گزرنے لگی۔ زرینہ پیدا ہوئی۔ ان کے یہاں کھانے کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا تھا۔ اس کی پارٹی جس شادی میں اپنا بینڈ لے کر پہنچ جاتی، رات کا کھانا وہیں سے مل جاتا تھا۔
برسوں ہو گئے۔ بیوی کا انتقال ہو گیا۔ زرینہ جوان ہو گئی۔ کبیر بوڑھا ہوتا چلا گیا۔
اب زمانہ کچھ اور ہو گیا تھا۔ بینڈ کا سسٹم ختم ہونے لگا تھا۔ شادیوں میں کیسٹ بجائے جاتے یا فنکشن ہوا کرتے۔ کلارنٹ کے فن کی کوئی قدر ہی نہیں رہی تھی۔
زرینہ نے کھانا تو لا کر رکھ دیا تھا لیکن خود اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر جانے لگی تو کبیر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''کیوں...... ناراض ہو گئی؟'' اس نے پیار سے پوچھا۔
''نہیں بابا! میں کیوں ناراض ہونے لگی؟''
''دیکھ بیٹا! میری بات اور مجبوریوں کو سمجھنے کی کوشش کر۔'' کبیر نے کہا۔ ''تو یہ چاہتی ہے کہ میں تجھے کلارنٹ سکھا دوں تاکہ تو میری بینڈ پارٹی میں کلارنٹ بجا سکے۔''
''ہاں بابا! میں یہی چاہتی ہوں۔''
''لیکن بیٹا! ہمارے یہاں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ لڑکیاں اس طرح بینڈ پارٹی میں شامل ہو سکیں۔ ایک تماشا بن کر رہ جائے گا۔''
''تماشا چاہے بنے یا چاہے نہ بنے لیکن تمہارا تو بوجھ کم ہوگا نا۔'' زرینہ نے کہا۔ ''میں دیکھتی ہوں کہ تمہاری سانس پھولنے لگی ہے۔ تم سے اب کلارنٹ نہیں بجایا جاتا۔ تمہاری

کھوئے ہوئے رشتوں کو پالینے کی خوشی کا دلفریب منظر

کچھ شخصیات دوسروں کے لیے بڑی فائدہ مند ثابت ہوتی ہیں۔ بالخصوص مشہور شخصیات...وہ بھی ایک مشہور شخصیت کا ہم سفر تھا اور اس مختصر سفر نے اس کی زندگی میں کتنی روشنی پھیلا دی شاید کسی کو اندازہ ہی نہ تھا۔

ہم سفر

ثمر عباس

صبح کا آغاز ہی کشیدگی سے ہوا تھا۔ پرانی شکایتیں سر اٹھا رہی تھیں اور میری کوئی وضاحت کام نہیں آرہی تھی لیکن لیموزین میں سفر کرتے ہوئے میں نے ایک اور کوشش کی۔ کینال پلس والے میرے فضائی سفر کے لیے تیسری فرسٹ کلاس سیٹ دینے کے لیے تیار نہیں تھے جبکہ بیٹی اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لے جانا چاہ رہی تھی۔ میں نے فلم اسٹوڈیو کو راضی کرلیا کہ وہ ایک فرسٹ کلاس کو دو عدد پریمیئم کوچ میں بدل دیں۔ انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لاس اینجلس سے پیرس تک

فرسٹ کلاس کا کرایہ تیرہ ہزار ڈالر تھا جبکہ پریمیم اکانومی کا ٹکٹ ساڑھے تین ہزار ڈالرز میں مل رہا تھا۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ میں نے جو حل تجویز کیا، اس کی بدولت نہ صرف یہ کہ شین ہمارے ساتھ سفر کر سکتا تھا بلکہ اس طرح اسٹوڈیو کو بھی چھ ہزار ڈالرز کی بچت ہو رہی تھی۔

بیٹی کو اس پر بھی اعتراض تھا۔ اس نے کہا۔ ”تمہیں ان کے پیسے واپس نہیں کرنے چاہئیں۔ تمہیں سختی سے بات کرنی چاہیے تھی اور تیسرے ٹکٹ کا مطالبہ کرنا چاہیے تھا۔“

میں نے کہا۔ ”ابھی تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ واقعی مجھ سے کام لینا چاہتے ہیں۔ اس مرحلے پر کوئی غیر ضروری مطالبہ کرنا مناسب نہیں۔“

میں ایک اسکرین رائٹر ہوں اور اس وقت تک میں نے ہالی وڈ میں صرف تین اسکرپٹ لکھے تھے۔ میری خصوصیت یہ تھی کہ موسیقی کے مناظر کو اس طرح لکھتا کہ وہ حقیقی معلوم ہوتے، چاہے ریکارڈنگ اسٹوڈیو میں ہوتی یا کسی کنسرٹ کے اسٹیج پر۔ اب میں ایک معاہدے پر گفتگو کرنے کے لیے پیرس جا رہا تھا۔ دراصل میں نے ستر کی دہائی کے مشہور گلوکار اور نغمہ نگار نک ڈیرک کی زندگی اور کارناموں کے بارے میں ایک مسودہ لکھا تھا لیکن ہالی وڈ میں کسی کو اس سے دلچسپی نہیں تھی۔ گو کہ میں نے اسے ایک پُرجوش شخصیت کے روپ میں پیش کیا تھا۔ طویل قامت، فاصلے پر رہنے والا بے حد باصلاحیت اور پھر اس نے خودکشی کر لی۔

میں نے فرانسیسی اسٹوڈیو کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اس میں ڈیرک کی ناکام کوشش کو اجاگر کر دیا جو اس نے فرانسیسی گلوکارہ، نغمہ نگار اور اداکارہ فرانکوئس ہارڈی سے تعلق جوڑنے کے لیے کی تھی۔ ڈیرک اس کے لیے گانے لکھنا چاہ رہا تھا۔ اس سلسلے میں ان دونوں کے درمیان کچھ ملاقاتیں ہوئیں اور ڈیرک اس سے ملنے پیرس بھی آیا لیکن یہ معاملہ آگے نہ بڑھ سکا۔ ڈیرک کے میوزک رائٹس دستیاب تھے اور اس سلسلے میں اسٹوڈیو کو ڈیرک کی بہن اداکارہ گبریل سے معاملات طے کرنا تھے۔ اس کے علاوہ یہ فیصلہ بھی ہونا تھا کہ ڈیرک کا رول کون پلے کرے گا؟ اس سلسلے میں میرے ذہن میں کچھ آئیڈیاز تھے۔ بہرحال میں بہت پُرامید تھا اور میرے لیے یہی ایک حوصلہ افزا بات تھی کہ ہم پیرس جا رہے تھے۔

لاس اینجلس ائرپورٹ جاتے ہوئے بیٹی کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے اسکارف پر لگی ہوئی جھالر سے بھی کھیل رہی تھی۔ یہ ایک منفرد اور جاذبِ نظر اسکارف تھا جو اس کے لباس اور جوتوں سے پوری طرح میچ کر رہا تھا۔ میری اس سے ملاقات بی اے اے میں ہوئی جہاں وہ استقبالیہ کلرک تھی اور پی آر او کی جاب ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ تیئس سال کی عمر میں اسٹوڈیو سٹی میں واقع میری چھوٹی سی رہائش گاہ میں منتقل ہو گئی۔ اس وقت شین چھ سال کا تھا اور میں نے اپنی چالیسویں سالگرہ منائی تھی۔ اس بات کو تین سال ہو چکے ہیں۔ پہلی بیوی سے عرصہ ہوا علیحدگی ہو چکی تھی اور اب طلاق بھی ہو گئی ہے۔ وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ مجھے معمولی سی اعصابی بیماری ہے۔ میں بہت جلد خوف اور مایوسی کا شکار ہو جاتا ہوں۔ ویسے بھی ایک لکھاری ہمیشہ عدم تحفظ میں مبتلا رہتا ہے۔ میں اپنے آپ کو سمجھاتا رہتا ہوں کہ اس کام میں معقولیت کی ضرورت نہیں۔ میرے اندر کی دنیا بہت خوبصورت ہے اور کوئی اس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔

بیٹی نے بھی بارہا مجھے یاد دلایا تھا کہ کامیاب لوگ اپنے آپ پر یقین رکھتے ہیں۔ شین اچھا لڑکا ہے، اس نے ہمیشہ اپنے باپ کی حمایت کی۔ وہ ایک ایکٹر ہے لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے کبھی بھی اپنے بیٹے کو سپورٹ نہیں کر سکا۔ شین نے اپنی میز پر اس کی تصویر بھی رکھی ہوئی ہے جس میں وہ گھوڑے پر سواری کر رہا ہے۔ شین اسے کاؤ بوائے سمجھتا ہے جبکہ یہ تصویر ایک اشتہاری فلم کی عکس بندی کے دوران لی گئی تھی۔

مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ ایک نوجوان عورت کے لیے اپنی ہی عمر کے مرد سے رومانس کرنے میں اس کا بچہ رکاوٹ بن جاتا ہے اسی لیے میں شین کا بہت زیادہ خیال رکھتا ہوں تاکہ وہ مجھ سے مانوس ہو سکے۔

شین اپنے فون پر کوئی گیم دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے متوجہ کرنے کے لیے کہا۔ ”دوستو خوش ہو جاؤ۔ ہم پیرس جا رہے ہیں۔ میں نے تو پوری کوشش کی تھی کہ ہم تینوں فرسٹ کلاس میں ہی سفر کریں۔“

”ایسا نہیں ہے پال۔“ بیٹی بولی۔ ”اور یہ تم بھی جانتے ہو۔“

شین نے مڑ کر ماں کی طرف دیکھا۔ کیا اسے معلوم ہو گیا ہے کہ گزشتہ شب میری اور بیٹی کی لڑائی ہوئی تھی؟ وہ وہی پرانا راگ الاپ رہی تھی۔ میں نے غور کیے بغیر ہی اس کا مشورہ مسترد کر دیا۔ میں اپنی شرائط پر اس کی رضامندی چاہ رہا تھا۔ گو کہ اس میں شفافیت نہیں تھی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ ایک لکھاری کو تنہائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس نے دوبارہ کہا کہ وہ میرے کام پر اثرانداز ہونا نہیں چاہتی بلکہ اس کی خواہش ہے

بیک اسٹوری

صبا مغل

تقدیر کا لکھا اٹل ہوتا ہے... زیرِ نظر کہانی پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ انسان چاہے کتنی احتیاط سے تدبیریں اختیار کرلے... تقدیر کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا... اس کا ماضی بھی بڑی خوب صورتی سے لفظ بہ لفظ ایک نئی داستان میں ڈھل گیا تھا۔

ایک جھوٹ کو پیار سے نباہنے والے ناکام عاشق کی کامیابی

زوبیا ابھی ابھی یونیورسٹی سے لوٹی تھی۔ سہ پہر کے چار بج رہے تھے۔ وہ فریش ہوکر اپنے اور ابو کے لیے چائے بنانے کا سوچ رہی تھی کہ اس کے موبائل کی بیل بج اٹھی۔ دوسری طرف آنٹی صوفیہ تھیں۔ وہ زوبیا کی مرحومہ والدہ کی پرانی دوست تھیں۔ کسی وقت وہ دونوں گورنمنٹ کالج میں پڑھتی تھیں اور دونوں میں خوب گاڑھی چھنتی تھی مگر پھر ایک وقت آیا کہ آنٹی صوفیہ انگلینڈ شفٹ ہوگئیں اور زوبیا کی امی بھی گھر گرہستی اور بال بچوں میں پڑ گئیں۔ بہر حال یہ سب تو

پرانے وقتوں کی باتیں تھیں۔ اب تو زوبیا کی امی کو وفات پائے ہوئے بھی سات آٹھ سال ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود کبھی کبھار آنٹی صوفیہ سے ٹیلی فونک رابطہ ہو جاتا تھا۔ آنٹی صوفیہ کا صرف ایک بیٹا راسم تھا۔ چوبیس پچیس سال کا ہو گا، وہیں لندن کے ایک آرٹ کالج میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

ٹیلی فون پر ابھرنے والی آنٹی صوفیہ کی آواز نے زوبیا کو خیالوں سے چونکا دیا۔

''ہیلو زوبیا...... ایک بار ہیلو کہہ کر کہاں کھو گئی ہو؟''

''کک...... کہیں نہیں آنٹی...... سمجھیں کہ یہ سوچ رہی تھی کہ آپ سے کیا بہانہ کروں۔ میں کل بھی آپ کو کتابیں پارسل نہیں کر سکی۔ ویری سوری آنٹی...... لیکن آج ضرور کر دوں گی بلکہ ابھی کر دیتی ہوں۔''

''نہیں بھئی! اب اتنی بھی کیا جلدی۔ یونیورسٹی سے تھکی ہوئی آئی ہو گی۔ کل کر دینا۔''

''کل تو یہاں چھٹی ہے آنٹی جان...... اور پرسوں سنڈے ہے۔ پھر بات پیر پر چلی جائے گی...... میں آج ہی کرتی ہوں...... آپ راسم سے کہہ دیں کہ انشاء اللہ فرائیڈے تک اسے کتابیں مل جائیں گی۔''

آنٹی صوفیہ سے بات کرنے کے بعد زوبیا نے چائے کا پروگرام کینسل کیا اور ریڈنگ روم میں چلی گئی۔ یہ کتابیں پارسل کرنے والا کام واقعی لٹکتا جا رہا تھا۔ دراصل آنٹی کے بیٹے راسم کو پتا نہیں کیسے...اسلامی تاریخی ناول پڑھنے کا شوق چرایا تھا۔ اس نے فون پر زوبیا سے ذکر کیا تو زوبیا نے بتایا کہ ابو کی لائبریری میں ایسی بہت سے بکس موجود ہیں۔ وہ پڑھنے کے لیے اسے بھیج سکتی ہے۔ اس نے ابو سے اجازت بھی لے لی تھی مگر یہ کام لیٹ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے لائبریری والے کمرے میں جا کر جلدی جلدی ہاتھ چلایا اور پارسل کے لیے مطلوبہ چار کتابیں علیحدہ کریں۔ گاڑی موجود تھی اور ڈرائیور بھی آس پاس ہی تھا۔ اس نے سوچا کہ پوسٹ آفس جا کر یہ کام ابھی نمٹا لے۔

وہ باہر نکلنے کا سوچ ہی رہی تھی جب ابو اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے پوچھا۔ ''کہاں کی تیاری ہے زوبیا؟''

وہ کتابیں اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''پارسل ابو...... جو پچھلے ایک ہفتے سے ہو نہیں پایا۔'' اسے ایک دم ابو کے چہرے پر فکر مندی اور جھنجلاہٹ نظر آئی۔ ذرا غصے سے بولے۔

''زوبیا! لگتا ہے کہ تم نے بس کتابیں اٹھائی ہیں اور چل پڑی ہو۔ تمہیں پہلے بھی کئی بار کہا ہے کہ جب کسی کو کوئی کتاب وغیرہ دی جائے تو پہلے اسے اچھی طرح دیکھ لینا چاہیے۔ اس میں کوئی ضروری کاغذ، تحریر، کوئی چیز یا کوئی رسید وغیرہ نہ پڑی رہ گئی ہو۔ احتیاط کرنی چاہیے۔''

''میں نے دیکھ لیا ہے ابو۔'' زوبیا نے انہیں اطمینان دلایا۔ ''تم نے جس طرح دیکھا ہو گا مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ ایک نمبر کی بے پروا ہو تم۔ لاؤ ادھر دو۔ میں دیکھتا ہوں۔'' وہ بدستور جھنجلائے ہوئے تھے۔

زوبیا نے مسکراتے ہوئے کتابیں ان کے سامنے رکھ دیں۔ جب سے ان کا بائی پاس ہوا تھا، وہ کچھ کمزور سے ہو گئے تھے۔ نظر پر بھی اثر پڑا تھا۔ پڑھنے کے لیے بڑے نمبر والی عینک لگاتے تھے۔ زوبیا کو معلوم تھا کہ اب وہ عینک کے لیے اپنی جیب ٹٹولیں گے اور عینک وہاں نہیں تھی۔ وہ یقیناً واش روم کے شیلف پر تھی جہاں انہوں نے ظہر کی نماز کے لیے وضو کیا ہو گا۔ زوبیا ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھی۔ خاص طور پر بڑی بہن کی شادی اور اکلوتے بھائی کے دبئی شفٹ ہونے کے بعد اس نے اپنی ذمے داریوں کو بہت اچھی طرح جانا اور سمجھا تھا۔ وہ گئی اور عینک لا کر بڑے پیار سے ابو کی آنکھوں پر لگائی تو وہ پارسل کی جانے والی کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ وہ بڑی احتیاط سے ان کی ورق گردانی کر رہے تھے جیسے ایک ایک صفحے کو دیکھ لینا چاہتے ہوں۔ زوبیا اپنے ہاتھوں کے پیالے میں اپنی ٹھوڑی ٹکائے محویت سے ابو کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی نگاہوں میں محبت تھی اور چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں بھی تھیں۔

اس رات کھانے کے بعد باپ بیٹی کامن روم میں بیٹھے تھے۔ کل چھٹی تھی اس لیے وہ دونوں ایزی موڈ میں تھے۔ زوبیا نے ابو کی طرف دیکھا اور ایک بے تکلف مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''ابو! آپ کہا کرتے ہیں نا کہ انسان کے ہر چھوٹے بڑے عمل کے پیچھے ایک بیک اسٹوری ہوتی ہے۔''

''ہاں، یہ تو ہے لیکن تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟''

''آج سہ پہر جب میں کتابیں پارسل کرنے جا رہی تھی، آپ نے بہت زیادہ توجہ اور احتیاط کے ساتھ کتابوں کو چیک کیا۔ اس کے پیچھے بھی تو ایک بیک اسٹوری ہے نا؟''

''کیا مطلب زوبی! کیا کہنا چاہتی ہو؟'' اس کے ابو نے ذرا چونک کر پوچھا۔

''مجھے وہ ساری بیک اسٹوری معلوم ہے ابو۔'' وہ بے تکلفی سے مسکرائی۔ ''امی نے ایک دفعہ مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ آپ کی اور ان کی محبت کیسے پروان چڑھی، کیسے اظہار ہوا، کیا مشکلات تھیں وغیرہ وغیرہ بلکہ......'' وہ کچھ کہتے

حبس

نعمان اسحاق

روپ بدلتی اس دنیا میں کیسے کیسے بہروپیے بستے ہیں، اس کا اندازہ زیرِ نظر تحریر پڑھ کر ہو سکتا ہے کہ بعض اوقات ایک سائے کو بھی دوسرے سائے کی خبر نہیں ہوتی کہ اس کی اصل حقیقت کیا ہے۔ ان دونوں میں بھی ایک جیسی گھٹن تھی جو رفتہ رفتہ بڑھتی جا رہی تھی مگر دونوں ہی ایک دوسرے کی کیفیت سے بے خبر اپنے اصل کو چھپانے کی فکر میں مبتلا تھے۔

دھیرے دھیرے اندر کی گھٹن اور باہر کے حبس سے آزادی پانے والے دوستوں کا قصہ

20 اگست 1989ء......

اس تاریخ کو میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ یہ میری زندگی کا سب سے عجیب دن تھا۔ آج جبکہ اس دن کو گزرے تیس سال ہو چکے ہیں اور میں پچیس سال کے خوش رو نوجوان سے.... بڑھاپے کی سمت..... سفر طے کر چکا ہوں کہ تمام حالات میرے ذہن میں اتنے تروتازہ ہیں کہ میں بہ آسانی اپنی یادداشتیں صفحے پر منتقل کر سکتا ہوں۔

میں آپ کو اپنے بارے میں بتاتا ہوں۔ میرا نام جیمز کلیرنس ہے۔ میں پچپن سال کا ہو چکا ہوں۔ قریب کی نظر کمزور ہو چکی ہے جس کی وجہ سے اخبار پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ اس کے سوا مجھے کوئی عارضہ لاحق نہیں اور میں صحت کی نعمت کو خوب اچھے سے انجوائے کرتا ہوں۔

پیشے کے لحاظ سے میں ایک مصور ہوں۔ اپنے ہنر میں بہت زیادہ کامل تو نہیں مگر اتنا ضرور کما لیتا ہوں کہ اپنی ضروریات احسن طریقے سے پوری کرسکوں۔ رشتے داروں میں صرف ایک بے اولاد بہن تھی جس کا دو سال پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ شادی کا جھنجٹ میں نے کبھی پالا نہیں، سو میں آزاد اور خودمختار زندگی بسر کررہا ہوں۔

بات ہو رہی تھی تیس سال قبل پرانی ایک صبح کی۔ یہ ایک پھیکی سی صبح تھی۔ میں نے قریب نو بجے ناشتا کیا تھا۔ ایک نظر صبح کے اخبار پر ڈالنے کے بعد میں نے اپنا سگار سلگا لیا اور اس امید پر باغیچے میں آبیٹھا کہ کوئی بھولا بسرا خیال ذہن میں اتر آئے اور میں اس خیال کو پنسل کی نوک سے ایک تصویر میں ڈھال پاؤں۔

گو کہ دروازے اور کھڑکیاں کھلی تھیں مگر پھر بھی ایک اکتا دینے والا حبس ہر شے پر حاوی تھا۔ اس وقت کون سی ایسی جگہ ہوگی جو اس قدر ٹھنڈی ہو کہ میں اس حبس بھری گرمی سے چھٹکارا پاسکوں۔ میں سوچنے لگا، یقیناً قریبی پارک کا سوئمنگ پول۔ میرے ہاتھوں میں کچھ ایسی طاقت سمٹ آئی کہ میں کاغذ کو رنگوں سے مزین کرنے لگا۔ اس تصویر کو میں کچھ ایسی دلجمعی اور توجہ سے بنا رہا تھا کہ مجھے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ میں نے دوپہر کا کھانا بھی چھوڑ دیا۔ میرے ہاتھ کینوس پر رنگ بکھیرتے رہے اور وہ تب ساکت ہوئے جب گھڑیال کو چار کا گھنٹا بجاتے ہوئے بھی کچھ لمحے بیت چکے تھے۔

تصویر مکمل ہو چکی تو میں نے ایک طائرانہ نظر اس پر ڈالی۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ میں پہلے کبھی اس قدر جامع تصویر نہیں بنا سکا۔

ایک مجرم ایسا کہ چہرے سے خشونت ٹپکتی، موٹا اس قدر کہ مٹاپے کے نیچے شخصیت کے دیگر پہلو مکمل طور پر چھپ چکے تھے۔ ٹھوڑی سے چہرے کے نیچے چربی کی تہ تھی جو ٹھوڑی کو دہرا کر دیتی اور معلوم نہ ہوتا کہ کہاں چہرہ ختم ہو رہا ہے اور کہاں سے گردن شروع ہو رہی ہے۔ چہرے پر کچھ ہی دنوں کی شیو تھی۔ سر پر ایک بال بھی نہ تھا۔ وہ ٹھنڈے پانی میں کھڑا تھا۔

بلکہ کھڑا ہوا کہنا غلط ہے، اس کا نچلا دھڑ پانی میں تھا مگر پاؤں زمین سے قریب ایک فٹ اٹھے ہوئے تھے۔ ہاتھ محض کلائیوں تک پانی میں تھے، باقی بازو اور اوپری دھڑ پانی سے باہر تھا۔

نیچے میں نے عبارت تحریر کی تھی۔

''قاضی کا فیصلہ۔ برائی کا انجام...''

اس کے گلے میں موجود پھانسی کے پھندے کے بل بھی کچھ ایسے واضح تھے کہ بہ آسانی گنے جاسکتے اور چہرے پر چھائی موت کی تلخی لمحے بھر کو خوف زدہ کر دیتی۔

اس تصویر میں ایسی کون سی کمی تھی جو اسے شاہکار کا درجہ دینے میں رکاوٹ بنتی۔ شاید کوئی بھی نہیں۔

ایسا اطمینان میں نے زندگی میں کم کم ہی محسوس کیا تھا۔

میں نے تصویر کو رول کیا اور بلاوجہ ہی اسے جیب میں رکھ لیا۔

مجھے یقین سا ہونے لگا کہ یہ تصویر ضرور تہلکہ مچا دے گی۔ اپنی خوش گمانیوں میں، میں لٹن اسٹریٹ میں ٹہلتا رہا اور پھر فلکرسٹ روڈ کی طرف مڑ گیا۔ فلکرسٹ روڈ پر میں جیسے جیسے نشیب کی طرف جاتا گیا، مجھے نئی ٹرام لائن بچھاتے مزدور اور ان کے سپروائزر نظر آنے لگے۔ اس کے بعد مجھے یاد نہیں میں کس طرف مڑا۔ ایک چیز جس نے مجھے بیزار کر دیا تھا اور میرے ذہن پر ایک دباؤ کی طرح چھاتی جارہی تھی، وہ سارے میں پھیلا حبس تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ گھٹن بڑھتی ہی جائے گی، یہاں تک کہ سانس لینا بھی ممکن نہ رہے گا۔ یوں ہی سر اٹھا کر اس امید پر میں نے آسمان کی وسعتوں کو کھوجا کہ شاید بادلوں کا کوئی ٹولا کسی اور سمت سے آرہا ہو اور یہاں سایہ فگن ہو جائے اور ایسی بارش ہو کہ جل تھل ہو جائے۔ مجھے اپنے گمان پر ہنسی آنے لگی۔ یہاں بھولے سے بھی کوئی بادل کا ٹکڑا نہ تھا اور میں جل تھل بارش کی امید لگائے کھڑا تھا۔

میں بلا مقصد پانچ یا چھ میل چلتا رہا جب ایک لڑکے نے مجھے پکار کر وقت پوچھا۔

''سات بجنے میں دس منٹ رہتے ہیں۔'' میں نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ لڑکا سر ہلاتا ہوا چلا گیا اور میں کچھ دیر کھڑا رہا۔ آس پاس نظر دوڑائی تو مجھے احساس ہوا کہ یہ قدرے اجنبی علاقہ ہے۔ گو کہ میں پچھلی ایک دہائی سے یہیں رہ رہا ہوں مگر اس طرف کبھی آنا نہ ہوا۔ اب دوبارہ پیچھے مڑوں یا گھر کی طرف جاؤں؟ طبیعت پر بیزاری کے ساتھ ساتھ تھکاوٹ بھی چھا چکی تھی۔ قبل اس کے کہ میں پیچھے کی طرف مڑتا، مجھے سامنے گلی میں ایک دلکش سی دکان دکھائی دی۔ دکان کے شوکیس پر مجھے کچھ منقش پتھر سجے ہوئے نظر آئے۔

دل میں تجسس ابھرا کہ دیکھوں کہ کس چیز کی دکان ہے۔ سو میرے قدم دکان کی طرف اٹھنے لگے۔

یہ ایک سنگ تراش کی دکان تھی۔ شوکیس میں کچھ قبروں کے کتبے اور گھروں اور دفاتر کے باہر آویزاں کرنے والی نیم پلیٹ ترتیب سے رکھے ہوئے تھے اور دکان کے باہر گیٹ پر کندہ تھا۔

جیمس اٹکنسن......سنگ تراش

انگریزی اور اطالوی پتھروں پر نام کندہ کرنے کے ماہر۔

چونکہ دکان باقی آبادی سے قدرے دور تھی، کچھ کام بھی

سجاد کے کانوں میں لوگوں کے بولنے کی آوازیں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح گونج رہی تھیں۔ یہ آوازیں سن کر اسے عجیب سی بے چینی کا، کچھ کھو دینے کا احساس ہو رہا تھا مگر وہ اپنے ان احساسات کی وجہ جاننے سے قاصر تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی بات اس کے لاشعور سے شعور کی سطح پر آنا چاہتی ہے۔ وہ ذہن پر زور دینے لگا مگر وہ بات اس کے ذہن کے کسی نہاں خانے میں ایسے گم تھی کہ باوجود کوشش کے وہ اسے بازیافت کرنے میں ناکام رہا۔ سوچ سوچ کر اس کے سر میں درد ہونے لگا۔

دفعتاً اسے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی پلکوں پر منوں بوجھ رکھا ہوا ہے۔

''لگتا ہے انہیں ہوش آ گیا ہے۔'' اس کے کانوں میں مانوس آواز پڑی، لیکن اپنی کیفیت کے باعث وہ اس آواز کو پہچاننے میں ناکام رہا۔

''سجاد بھائی......'' کوئی اسے پکار رہا تھا۔ اس نے

قدرت کے انتقام سے بے خبر ایک گھمنڈی انسان کی کتھا

بے شک زندگی کا اصل مقصد بھول بھلیوں میں درست سمت تلاش کرنا ہے اور انسان اسے ہی بھول جاتا ہے... اسے بھی بڑا زعم تھا کہ بعد از مرگ کوئی تو اس کا نام لیوا ہوگا... کسی کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھا کریں گے مگر اسے یاد ہی نہیں رہا کہ زندگی میں وہ کیسی بھول کر بیٹھا ہے اور اسے ہر حال میں اس کا تاوان ادا کرنا پڑے گا۔

بھول

کبیر عباسی

بولنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔اسے بے پناہ کمزوری اور بے بسی کا احساس ہو رہا تھا۔بے بسی کے اس احساس نے اس کی آنکھوں کو آنسوؤں سے بھر دیا۔اسے اپنے گالوں پر گرم گرم پانی بہنے کا احساس ہونے لگا۔

''اوہ...... یہ تو نیم بے ہوشی میں بھی رو رہے ہیں۔'' اس کے کانوں میں تاسف زدہ آواز پڑی۔

''میرا خیال ہے انہیں ابھی آرام کی مزید ضرورت ہے۔میں ان کے لیے انجکشن تیار کرتا ہوں۔'' اس کے کانوں میں کچھ ملی جلی سی آوازیں پڑیں اور پھر اسے اپنے بازو میں چبھن کا احساس ہوا۔اس کے چہرے پر تکلیف کے تاثرات ابھرے۔ وہ ہلکا سا کراہا۔ اس کے ذہن میں چھائے خیالات گڈمڈ ہونے لگے۔اس حالت میں بھی ایک احساس واضح تھا۔کچھ...... یا شاید سب کچھ کھو دینے کا احساس......

وہ اس احساس کو کھوجنے کی کوشش کرنے لگا لیکن لمحوں میں ہی اس کے سارے احساسات، سارے خیالات کو گہری تاریکی نے نگل لیا۔

☆☆☆

گھڑی شب کے دو بجا رہی تھی۔منیر احمد اپنے کمرے میں چت لیٹے، خالی خالی نظروں سے چھت کو گھور رہے تھے۔ان آنکھوں نے آج خوب پانی برسایا تھا لیکن اس وقت ان کے سوتے بھی جیسے خشک ہو چکے تھے۔

کمرے میں گہرا سکوت چھایا ہوا تھا تاہم ان کے ذہن میں ابھی تک چیخ و پکار اور رونے دھونے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔وہ ان آوازوں سے پیچھا چھڑا کر سکون کی نیند سونا چاہتے تھے مگر یہ ان کے بس میں نہ تھا۔دن بھر سنی جانے والی یہ آوازیں ان کے دماغ کے ساتھ جیسے چپک کر رہ گئی تھیں۔ان آوازوں سے تنگ آ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔انہوں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر پٹ سلائڈ کیا۔ان کے چہرے سے سرد ہوا کا جھونکا ٹکرایا۔ اکتوبر کا مہینا تھا۔رات خاصی ٹھنڈی ہو جاتی تھی اور کوئی وقت ہوتا تو سرد ہوا انہیں خاصی تکلیف دہ محسوس ہوتی مگر اس وقت ان کی جو کیفیت تھی، انہیں یخ بستہ ہوا نے فرحت بخش احساس دلایا۔ان کے اندر کی گھٹن دور ہونے لگی۔

دفعتاً ان کی نگاہ لان پر پڑی۔ان کے دل پر گھونسا سا لگا۔خشک آنکھوں سے ایک بار پھر گرم پانی کے چشمے پھوٹنے لگے۔انہوں نے آنکھیں سختی سے میچ لیں۔ان کے ذہن کے پردے پر فلم سی چلنے لگی۔وہ لان کی بینچ پر بیٹھے تھے۔ان کے اردگرد ایک پرچھائی سی حرکت کر رہی تھی۔وہ پرچھائی بار بار انہیں پکار رہی تھی، اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔وہ اخبار سے لمحے بھر کے لیے نظر اٹھاتے۔ان کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ رینگنے لگتی۔وہ مسکراتے ہوئے کچھ کہتے اور پھر اخبار پر نظریں مرکوز کر لیتے۔

ان کانوں میں پھر پکار پڑتی۔اس بار اس آواز میں خفگی کا عنصر بھی شامل ہوتا۔وہ اخبار لپیٹ کر ایک طرف رکھتے اور پوری طرح سے اس پکار کی طرف متوجہ ہو جاتے۔

''آہ......'' بے اختیار ان کے دل سے ہوک اٹھی۔انہوں نے کھڑکی بند کی اور کمرے میں ٹہلنے لگے لیکن اندر کی بے چینی کو کسی طرح قرار نہیں آ رہا تھا۔وہ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔

ساتھ والے کمرے کا دروازہ انہوں نے احتیاط سے کھولا۔کمرے میں زیرو واٹ کا بلب روشن تھا۔وہ دھیرے سے چلتے ہوئے سجاد کے پاس آئے۔وہ ٹرنکولائزر کے زیر اثر گہری نیند سو رہا تھا۔منیر احمد کو اس پر بے اختیار رشک آیا۔

سجاد کے ساتھ والے بیڈ پر ان کے سالے کا بیٹا نزاکت گہری نیند سو رہا تھا۔ان کی نظر سائڈ ٹیبل پر رکھی دواؤں پر پڑی۔ان میں سلیپنگ پلز کی شیشی بھی موجود تھی۔انہوں نے شیشی اٹھائی اور دھیرے سے باہر نکل آئے۔

منیر احمد ساٹھ کے پیٹے میں داخل ہو چکے تھے۔ان کی ڈاڑھی اور سر کے بال مکمل طور پر سفید تھے لیکن جسمانی طور پر وہ پوری طرح چاق و چوبند تھے۔سفید ڈاڑھی اور سرخ و سفید رنگت کے باعث ان کی شخصیت میں عجیب بزرگانہ سی کشش موجود تھی، جو ان سے ملنے والے ہر شخص پر اپنا رعب طاری کر دیتی تھی۔وہ اپنی اس رعب دار شخصیت سے بھرپور فائدہ اٹھاتے تھے مگر اس وقت ان کے کندھے ڈھلکے ہوئے تھے۔سرخ و سفید رنگت میں زردی کھنڈ رہی تھی۔

وہ جس سانحے سے گزرے تھے، اس کا انہوں نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔انہیں آج کی صبح یاد آ رہی تھی، چمکیلی اور روشن صبح......رات بھر بارش کے بعد ہر چیز نکھری نکھری لگ رہی تھی۔وہ لان کی بینچ پر بیٹھ کر نرم گرم سی دھوپ کا مزہ لے رہے تھے۔انہوں نے ناشتا بھی لان میں ہی کیا تھا۔موسم کی خوبصورتی نے ان کے اندر عجیب ترنگ سی بھر دی تھی۔وہ دھیمی آواز میں گنگنا رہے تھے کہ اچانک انہوں نے ''دھپ'' کی آواز سنی۔یہ آواز سنتے ہی یکدم انہیں کسی

وقت

حسام بٹ

موت کے کنویں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب تھا۔ ایک ایسے پرعزم بازی گر کی بازی گری ...... سنسنی خیر واقعات پر مشتمل ایک دلربا طویل داستان

وقت بادشاہ اور کائنات کی ہر شے اس کی رعایا ہے لیکن ... اس کی نہ کوئی شکل اور نہ ہی وجود ہے۔ اس کے باوجود یہی وقت روپ بدل بدل کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی پل میں کسی کو بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین کی خاک چاٹنے پر مجبور کردیتا ہے۔ کبھی دن اور رات میں ڈھل کر عمر رواں کا نام پاتا ہے اور موسم کی طرح گزر جاتا ہے۔ کبھی مہربان اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی محبت بن کر ہونٹوں پر ہنسی بکھیرتا ہے اور کبھی درد کی صورت آنسو بن کر دلوں میں گھاؤ ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن ... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دو بوند پانی تک نہیں ملتا اور اتنا بے ایمان بھی ہے کہ جس پر اپنی مرضی سے مہربان ہوجائے اس کے لڑکھڑاتے قدموں سے بھی قدم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی طرف بھی دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی مہربان لمحے کا اسیر تھا... جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی اس کے باوجود اس کی داستان حیات میں چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین امتزاج... ایک ایسا سلسلہ جو برسوں یاد رہے گا۔

تینتیسویں اور آخری قسط

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

اس کا نام اسد علی رکھا گیا جسے ”علی“ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ علی اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو خود کو علی سلطان کی نگہداشت میں پایا۔ علی سلطان ٹیکساس (امریکا) کا ایک معتبر کاروباری شخص تھا۔ ایک حادثے نے علی سلطان کو وہیل چیئر تک محدود کر دیا تھا۔ اس کی اپنی بیوی ریٹا میگڈالین سے علیحدگی ہو چکی تھی۔ وقتِ رخصت ریٹا اپنی اکلوتی بیٹی لفنی کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ علی سلطان نے اپنی اور علی کی دیکھ ریکھ کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ رکھی ہوئی تھی اور بچپن سے جوانی تک علی کی تعلیم و تربیت کے تمام تر اخراجات اٹھائے تھے۔ اپنے والدین کے حوالے سے علی کے ذہن میں سیکڑوں سوالات اس کے ساتھ ہی پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ اس نے جب بھی انکل سلطان سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو اس نے اسے ٹال دیا۔ کالج میں قدم رکھتے ہی علی نے ٹیکساس کے علاقے اینگلٹن میں واقع ”سرکل اے“ نامی ایک اسٹور پر جز وقتی ملازمت کر لی تھی۔ بیس سال کی عمر میں جب علی نے سائیکالوجی میں بیچلر ڈگری حاصل کر لی تو نت نئے ہنگامے اس کے تعاقب میں لگ گئے۔ ایک روز دو میکسیکن لڑکے ڈکیتی کی نیت سے ”سرکل اے“ میں گھس آئے۔ تمام کیش لوٹنے کے بعد وہ ڈکیت علی کے ساتھ موجود سیلز مین نظار کو شوٹ کر گئے۔ پولیس نے شک کی بنیاد پر علی کو بھی شاملِ تفتیش کر لیا۔ بعد ازاں ان دونوں میکسیکن ڈکیت کو فی نکس (ایری زونا) سے گرفتار کر لیا گیا۔ علی کا کالج لیک جیکسن (ٹیکساس) میں تھا جبکہ علی سلطان کی رہائش بے سٹی (ٹیکساس) میں تھی۔ علی ایک ہوٹل میں رہتا تھا اور لیک جیکسن کے اکثر ریسٹورنٹس میں اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ”ونی لاؤنج“ نامی ایک ریسٹورنٹ میں ہسپانوی دوشیزہ شارو اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اس نے علی کے دردل پر دستک دی تو اس کی زندگی میں بہار اتر آئی۔ ایک رات ونی لاؤنج میں جب لیونارڈو نامی ایک میکسیکن غنڈے اور اس کے حواریوں نے شارو سے بدتمیزی کی کوشش کی تو علی بیچ میں کود پڑا۔ اس مارا ماری کو ایک امیر و کبیر اسپینش لیڈی ڈیلفینا نے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا وزیٹنگ کارڈ علی کو تھما کر رخصت ہوگئی...... اس واقعے کے بعد گویا لیونارڈو سے علی کی دشمنی کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا۔ لیونارڈو نے اپنی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے شارو کو ٹارگٹ کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ ونی لاؤنج والے ناخوشگوار واقعے کی بنا پر علی نے شارو کی ریسٹورنٹ والی جاب چھڑوا کر اسے انکل سلطان کی خدمت کے لیے گھر میں رکھ لیا تھا۔ ایک روز شارو کو لیونارڈو نے اغوا کر لیا۔ علی نے شارو کی تلاش میں ہمت نہ ہاری اور شارو کو ڈھونڈتا رہا بالآخر ایک رات لیونارڈو کا ایک قریبی ساتھی پبلو اس کے ہتھے چڑھ گیا۔ علی نے طیش کے عالم میں پبلو کو قتل کر دیا۔ پولیس قاتل کی تلاش میں تھی۔ لیک جیکسن میں مزید قیام خطرناک ثابت ہو سکتا تھا لہٰذا علی نے ڈیلفینا سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ ڈیلفینا نے علی سے کہا کہ اگر وہ بہتر گھنٹے تک باہر کی دنیا سے کٹ کر اس کے ساتھ بنگلے میں رہے تو وہ اسے تمام مسائل سے نجات دلا دے گی۔ راضی ہونے پر ان بہتر گھنٹوں میں ہر پل علی پر حیرتوں کا ایک نیا در وا ہوتا رہا۔ ڈیلفینا نے اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے علی کو پبلو مرڈر کیس سے اس طرح نکال لیا جیسے مکھن سے بال...... علاوہ ازیں ڈیلفینا نے ٹھوس ثبوت کی مدد سے علی کو بتایا کہ لیونارڈو، شارو کو اغوا کر کے کیوبا کے شہر ہوانا لے گیا ہے جہاں وہ شارو کو عصمت فروشی کے جہنم میں جھونکنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ڈیلفینا نے علی کو یقین دلایا کہ اگر وہ بہتر گھنٹے پورے ہونے کے بعد اس کی ایک خواہش پوری کر دے تو وہ شارو کو صحیح سلامت واپس لے آئے گی۔ شارو کے حصول کی خاطر علی ڈیلفینا کی بات ماننے کے لیے تیار ہو گیا۔ پریسٹن ہالو والے اس بنگلے میں ڈیلفینا کی سنگت میں گزرنے والے وہ طلسم ہوش ربا بہتر گھنٹے بڑے رنگین، سنگین، رومان پرور اور ناقابلِ یقین تھے۔ ڈیلفینا کی شخصیت کسی معمے سے کم نہ تھی...... اس پر مستزاد، ڈیلفینا نے اپنے ہی ایسی دو پراسرار شخصیات ربی آئزک باروخ لاؤ اور یما ایپل بام سے علی کی ملاقات بھی کروا دی۔ تب علی پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ تمام افراد یہودیوں کی ایک سیکرٹ اور بہت طاقتور سوسائٹی ”اسکل اینڈ بونز“ سے تعلق رکھتے تھے جو لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں آزاد تھے۔ انہیں علی کے ہم عمر ایک ایسے نوجوان کی تلاش تھی جس کی ماں مسلمان اور باپ عیسائی تھا۔ انہیں شک تھا کہ علی وہی نوجوان ہے جس کے والدین اسے علی سلطان کے حوالے کر کے کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ ڈیلفینا کی تمنا تھی کہ علی ان کی شرائط پر صاد کرتے ہوئے ”اسکل اینڈ بونز“ کی رکنیت حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر کر دے لیکن علی نے ڈیلفینا کی خواہش کو ٹھکرا دیا اور ڈیلس سے بے سٹی اپنے انکل کے پاس آ گیا۔ یہاں حالات کی ایک نئی کروٹ اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ انکل نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں علی کو اس کی زندگی کے دیرینہ اور سربستہ راز سے آگاہ کر دیا۔ علی سلطان کے مطابق، انیس سال پہلے، ایک برس کی عمر میں علی کو کراچی (پاکستان) سے نیویارک (امریکا) مرزا عامر بیگ کے پاس پہنچایا گیا تھا۔ مرزا عامر بیگ، علی سلطان کا دوست تھا۔ اس نے علی کو علی سلطان کے حوالے کر دیا تھا۔ علی سلطان نے ایک گارجین کی حیثیت سے انیس برس تک علی کی پرورش کی تھی۔ اس سلسلے میں ہونے والے تمام تر اخراجات کراچی میں مقیم ایک نیک خاتون برداشت کر رہی تھیں مگر پچھلے چند ماہ سے اچانک کراچی سے یہ رقم آنا بند ہو گئی تھی جس سے مرزا عامر نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ خاتون کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہے چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ علی کو فی الفور کراچی روانہ ہو جانا چاہیے۔ علی سلطان اور مرزا عامر بیگ کا اندازہ تھا کہ اس خاتون کا علی کے ساتھ کوئی خونی رشتہ ہے۔ مرزا عامر بیگ نے علی کو چند ایسے اشارے دیے جن کی مدد سے علی کراچی میں اس خاتون کو تلاش کر سکتا تھا۔ علی نے تیاری کی اور بوسٹن سے کراچی آ گیا۔ علی کی دوستی عظیم نامی نوجوان سے ہو گئی۔ عظیم نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے علی کی والدہ کا پتا لگا لیا اور انہیں گھر لے آیا۔ علی کی ملاقات اپنی ماں سے ہو گئی۔ علی کو اپنی ماں کے حالات جان کر بہت دکھ ہوا اور وہ دشمنوں سے انتقام لینے کے بارے میں سوچنے لگا۔ علی ماں کے بنگلے پر رہنے لگا۔ وہیں اسے اطلاع ملی کہ انکل علی سلطان کا دل کے دورے کے سبب انتقال ہو گیا ہے۔ علی نے ماں کو امریکا ساتھ لے جانے کے لیے وزٹ ویزا کے حصول کے لیے کوشش شروع کر دی۔ کچھ نا معلوم

افراد نے حملہ کر کے علی کی والدہ کو قتل کر دیا۔ علی نے تہیہ کرلیا کہ وہ ماں کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچائے گا۔ علی نے تمام حقیقت پینا کو بھی بتا دی جو علی کی اچھی دوست اور ہمراز بن گئی تھی۔ علی کو اس کی رہائشگاہ کے پتے پر ایک خط ملا جس میں اس کی ماں کے قتل کا اعتراف کیا گیا تھا۔ علی نے نادر شاہ کو چیک کرنے کا ارادہ کیا۔ علی نے عظیم کے ساتھ مل کر منصوبہ بنایا کہ نادر شاہ کو اغوا کر کے اس سے سچ اگلوایا جائے۔ عظیم نے کچھ لوگوں کو پیسے دے کر نادر شاہ کو اغوا کرایا۔ تاہم اس میں سے ایک شخص نے عظیم کو کال کر کے بتایا کہ ان کے آدمیوں کو پولیس نے گھیر لیا ہے۔ نادر شاہ اور اغوا کنندگان پولیس کی تحویل میں پہنچ گئے تھے۔ علی نے فوری طور پر بنگلا چھوڑ دیا اور اپنی دوست پینا کے ہمراہ اس کے فلیٹ پر آ گیا۔ علی کو شدومد سے تلاش کیا جارہا تھا۔ اس کے در پردہ ڈیلفینا کا ہی ہاتھ تھا۔ علی نے نادر شاہ کو سبق سکھانے کے لیے اسے قابو کیا اور بدترین تشدد کر کے اسے محتاجی کی زندگی گزارنے کے لیے چھوڑ دیا اور اپنی ماں کے بنگلے کو نذر آتش کر دیا۔ علی کو ایک عورت کی مدد سے ٹریس کرلیا گیا اور نامعلوم جگہ پر پہنچا دیا گیا۔ وہاں ایک شخص ملا جس نے علی کو بتایا کہ وہ راس آئی لینڈ پر ہے جہاں اسے چالیس دن گزارنے ہیں۔ وہیں اسے ایک لڑکی کایا مل گئی جس سے دوستی ہونے پر اس نے بتایا کہ وہ اسکل اینڈ بونز کے لیے کام کرتی ہے اور اسے جان بوجھ کر وہاں بھیجا گیا ہے۔ ہٹ میں پیڈرو نامی شخص آیا جسے علی نے پہچان لیا کہ وہ چنگیز خان ہے۔ علی نے اسے اذیت ناک موت دی اور اپنے انتقام کی آگ بجھائی۔ جب آسکر کایا کو لینے آیا تو علی کی مدد سے اسے قابو کرلیا گیا اور کایا نے اسے بھیانک موت دی۔ علی نے آسکر کا روپ دھار لیا اور کایا اور وہ بذریعہ جہاز کرائسٹ چرچ ائرپورٹ پر لینڈ کر گئے۔ علی اور کایا ایک ولا میں پہنچ گئے، مگر اسکل اینڈ بونز نے انہیں ٹریس کرلیا۔ وہ دونوں وہاں سے نکلے اور کافی مارا ماری ہوئی۔ تاہم وہ بچ نکلنے میں کامیاب رہے۔ وہ دونوں ایک موٹیل میں ٹھہرے جہاں سے کایا کو اغوا کرلیا گیا۔ علی اس کی مدد کے لیے گیا، مگر وہ کایا کو نہ بچاسکا اور وہ ماری گئی۔ وہیں اچانک اس کی ملاقات جی ایم سر سے ہوگئی۔ جی ایم سر نے علی کو آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ علی کو جہاز میں ایک لڑکی روماتل ملی۔ اس نے ایک جگہ فائرنگ کر کے کسی کو جان سے مارنا چاہا۔ نتیجے میں کچھ لوگ اس کے پیچھے لگ گئے۔ علی نے بھی اس کا تعاقب کیا اور روماتل کا تعاقب کرنے والوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہ کافی مارا ماری کے بعد وہاں سے بھاگ نکلا۔ علی میونخ آ گیا۔ وہاں ہوٹل میں ویٹر نے علی کو کسی عورت کی آمد کے بارے میں بتایا اور کہا کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے۔ علی جس میں پہنچا تو وہاں روماتل توریز موجود تھی۔ اچانک وہاں زوردار دھماکا ہوا اور روماتل علی کو لے کر ہوٹل سے نکل گئی۔ وہ دونوں ایک ہوٹل میں ٹھہر گئے۔ روماتل نے علی کی اصلیت کھوج لی اور کہا کہ اسے ایک مشن میں علی کی مدد درکار ہے۔ سوئے اتفاق وہ جس مشن پر جارہی تھی وہیں شارو بھی موجود تھی، اسے سائنس داں فریڈرک کی تجربہ گاہ سے کچھ فائلیں چرانا تھیں۔ علی اور وہ وہاں پہنچے۔ روماتل نے وہاں کارروائی کی اور شارو کے ہمراہ نکل گئی۔ علی وہاں سے فوکسی کار میں نکلا تو ریڈ اوپل اس کے تعاقب میں تھی۔ علی نے اس میں سینئر بونز مین رابرٹ کو دیکھا۔ علی نے راستے میں رابرٹ کو قابو کرلیا اور اس کے ساتھ عبرتناک تشدد کر کے اسے زندہ چھوڑ دیا تاکہ سوسائٹی والوں کو عبرت ہو۔ اس کے بعد علی اوسک میں دینارا کے اپارٹمنٹ پہنچ گیا۔ روماتل کا نام جیسیکا تھا۔ اس نے شارو کو دینارا کے اپارٹمنٹ میں پہنچا دیا تھا۔ دینارا نے شارو اور علی کی نئی آئی ڈیز بنوادیں۔ جس دن شارو اور علی کو نکلنا تھا تو علی کی اچانک آنکھ کھل گئی۔ اپارٹمنٹ میں گڑبڑ تھی۔ ایک دراز قامت سیاہ فام نے دینارا کو ٹھکانے لگانے کے بعد علی کو مارنا چاہا تاہم علی نے اسے جہنم واصل کر دیا۔ جب وہ اور شارو وہاں سے نکلنے لگے تو علی نے وہاں گاڑی کے ساتھ ایک تابوت رکھا دیکھا۔ اس میں سے ایک خط برآمد ہوا جس میں ایس این بی والوں نے علی اور اپنے راستے الگ الگ کرنے کا عندیہ دیا۔ علی اور شارو کو ٹھکانے لگانے کے لیے ایک سیاہ فام نے دوبارہ حملہ کر دیا، یہ سیاہ فام کلون تھے جو ہم شکل تھے تاہم علی نے اسے بھی ختم کر دیا۔ علی اور شارو ایک ہوٹل میں مقیم ہوگئے۔ علی نے روحانی پرواز کے ذریعے لاکر روم تک رسائی حاصل کرلی اور وہاں گڑبڑ کا پتا لگالیا۔ علی ٹائم ٹریولنگ کے ذریعے کاتیا کے اپارٹمنٹ میں پہنچا تو وہاں اس کا سامنا کلون سیاہ فام سے ہوگیا۔ علی نے اسے بھی ختم کر ڈالا۔ علی نے اپنی روحانی طاقت کے ذریعے پتا لگالیا کہ ایس این بی والے اسے ختم کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور اس مقصد کے لیے انہوں نے دس افراد کی ایک ٹیم روانہ کردی تھی۔ علی اور شارو وہاں سے نکلے تو کافی مارا ماری ہوئی۔ تاہم جیسیکا کے کارندے نے بحفاظت علی کو اسی ہوٹل کے ایک دوسرے کمرے میں پہنچا دیا۔ شارو زخمی ہوگئی تھی۔ علی روحانی پرواز کر کے رابرٹ کے پاس پہنچ گیا اور اسے عبرتناک انجام سے دوچار کیا۔ علی نے کاتیا کی مدد کے لیے اسے اپنے ساتھ ملالیا اور اسے دشمنوں سے بچانے کے لیے کوشش کرنے لگا۔ اس نے جیسیکا سے رابطہ کیا اور اس سے ٹائم بم لے کر انہیں جیمس کی رہائش گاہ اور سلاوس پارک کلینک پر نصب کر دیا جو وہاں بڑی تباہی کا باعث بنے۔ علی نے ایڈتھ کے اپارٹمنٹ میں رہائش اختیار کرلی۔ علی نے کاتیا کو رشین ایمبیسی سے ریسکیو کیا اور اسے ایڈتھ کی گاڑی میں سوار کرا دیا اور اسے ایڈتھ کے اپارٹمنٹ بھیج دیا۔ علی نے ایس این بی کے دو ممبران کو ٹھکانے لگا دیا اور ادھر ڈیلفینا کے بریف کیس سے اسٹوڈیو اپارٹمنٹ کے ڈاکیومنٹس بھی چرا لیے۔ تاہم اس نے ڈیلفینا کو آگاہ کر دیا کہ یہ سب اسی نے کیا ہے اور وہ اس کی مدد کرسکتا ہے لیکن ڈیلفینا نے اس کی پیشکش رد کر دی، علی جیسیکا کے ساتھ سیاہ فام کلون کی فیکٹری تباہ کرنے پہنچ گیا۔ انہوں نے کلون فیکٹری کو تباہ کر دیا۔ جیسیکا نے ایجنسی کو خیرباد کہہ دیا ادھر جیسیکا کے آدمی نے شارو کو ریسکیو کر دیا تھا مگر اس نے جیسیکا سے غداری کی اور اپنے بڑوں کو اس کے متعلق رپورٹ دے دی۔ ایجنسی اس کے پیچھے پڑگئی جیسیکا نے انہیں سبق سکھانے کا عہد کیا اور علی کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ اس کی خواہش کی تکمیل میں علی نے آنکھیں بند کرلیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

خاموشی

مظہر سلیم ہاشمی

اگر کوئی خیال بار بار اتنا پریشان کرے کہ انسان زچ ہو جائے تو وہ لاشعوری طور پر ویسا ہی عمل بھی کر ڈالتا ہے جیسے کہ اس کی خاموشی میں برپا ہونے والا وہ ناگوار شور اسے بار بار ہراساں کرتا تھا مگر اس سے چھٹکارے کا کوئی رستہ سجھائی نہ دیا تھا لیکن... ایک خیال نے اسے وہ راہ دکھا ہی دی۔

خاموشی سے وار کرنے والی ایک خطرناک بلا کا انداز

قبل از کرسمس کی صبح اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ روشن تھی۔ قبرستان میں خاموشی چھائی ہوئی تھی گویا سکون کا دور دورہ تھا۔ برف سے اَٹے ہوئے راستے پر بہ مشکل چلتے ہوئے، ماڈ کے حلق سے ایک سرد آہ نکل گئی۔ البتہ اس آہ کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ وہ بالکل تنہا تھی اور اس کا کوئی سامع نہیں تھا۔ صبح کے اس پہر کسی ذی روح کے آثار تک نظر نہیں آرہے تھے......اور یہ ناممکن تھا کہ اس کی وجہ سے کسی کو پریشانی ہوتی۔

وہ پہیوں والے ایک ''واکر'' کی مدد سے چل رہی تھی۔ برف گہری ہونے کے سبب واکر کے پہیے اس میں دھنسے جا رہے تھے لیکن قدرے دشواری کے ساتھ وہ اسے اپنی مطلوبہ قبر کے ساتھ ٹھہرانے میں کامیاب ہو ہی گئی۔ واکر کے ساتھ لگی باسکٹ میں سے اس نے اگربتیوں کے پیکٹ اور ماچس نکالی۔ چند موم بتیاں بھی موجود تھیں جنہیں جلا کر وہ دلی تسکین حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس کے خاندان کی قبروں کے لیے دو پیکٹ ہی کافی تھے...... ماں باپ اور ان کے علاوہ ایک بڑی بہن کی قبر۔ ویسے بھی بڑھتی مہنگائی میں وہ دو سے زائد پیکٹوں کا استعمال فضول خرچی میں ہی شمار کرتی تھی۔

اس کی بڑی بہن کا نام شارلٹ تھا۔ وہ اپنی بہن سے گیارہ برس چھوٹی تھی...... اس کی پیدائش اس کے والدین کے لیے جہاں خوشگوار حیرت کا سبب بنی تھی، وہیں پر شارلٹ کی سخت ناپسندیدگی کی وجہ بھی بنی تھی۔ شارلٹ اکلوتی اولاد کے مزے اڑانے کی عادی تھی اس لیے ایک چھوٹی بہن کی آمد اس کی نازک طبیعت پر سخت گراں گزری تھی۔

ماڈ کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس کے والدین کیسی کیسی شاندار دعوتوں کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ نئے سال کی آمد پر تو ان کے گھر میں جو روایتی دعوت ہوتی تھی، اس کا پورے شہر میں کئی دن تک چرچا رہتا تھا۔ لذیذ کھانے، شمع دانوں میں روشنی بکھیرتی موم بتیاں، آدھی رات کو شیمپین کی بوتلیں کھلنے کی آوازیں، مہمانوں کی خوش گپیاں، سگار اور مہنگے پرفیوم کی ملی جلی مہک...... یہ سب اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ...... خواتین زرق برق پوشاکیں اور قیمتی لباس پہن کر اتراتی پھرتی تھیں۔

ان کے بہترین طرزِ حیات کو دھچکا تب پہنچا جب ماڈ کے باپ کی اچانک ہارٹ اٹیک سے موت ہو گئی۔ وہ دوستوں کی محفل میں بیٹھا کسی لطیفے پر قہقہے لگا رہا تھا جب اس کے دل نے باقی جسم کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔

اگرچہ بعد میں لوگ ہمیشہ اس کے باپ کی موت کو ایک مزاحیہ واقعہ قرار دیتے تھے لیکن ماڈ کی ماں نے اپنے شوہر کی موت کے بعد خود پر سوگ کی سی کیفیت طاری کر لی۔ باپ کی موت کے بعد ہی ماڈ کو اندازہ ہوا کہ وہ اتنے خوشحال بھی نہیں تھے جیسا کہ اس کے باپ نے گھر کے ماحول سے ظاہر کر رکھا تھا۔ کاروبار کو نقصان سے محفوظ رکھنے کے لیے وہ ایک جگہ سے ادھار پکڑ کر اور پھر دوسری جگہ دے کر اپنا کام چلا رہا تھا۔ تمام قرضہ اتارنے کے بعد اب ان کے پاس کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ ماڈ کے باپ کی بنائی گئی وسیع و عریض جائیداد بھی قرضہ اتارنے کی مد میں فروخت ہو گئی۔ بیوی اور بچیوں کے حصے میں بس وہی اپارٹمنٹ بچا جس میں وہ رہائش پذیر تھیں۔

ماڈ کی ماں اگرچہ اپنے شوہر سے پندرہ سال چھوٹی تھی لیکن صدمے نے اسے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنا اور لڑکیوں کا خیال کرتی وہ مزید ڈھے سی گئی۔ وہ ایسے زندہ لاش کے مانند پھرتی تھی جیسے ماڈ کے باپ کے ساتھ ساتھ اس کی بھی موت واقع ہو چکی ہو اور اسے اس کے ساتھ ہی دفنا دیا گیا ہو۔ شوہر کی موت کے بعد دو سال بھی اس نے بہ مشکل نکالے اور حقیقتاً قبر میں جا سوئی۔

ماڈ کو ہمیشہ ایسا ہی محسوس ہوتا تھا کہ اس کی ماں...... باپ کی موت سے زیادہ خوشحال زندگی سے محرومی کے صدمے کا شکار ہوئی تھی۔ اسے غریب بن کر رہنا گوارا نہیں تھا اس لیے وہ خود کو سنبھال نہ پائی اور موت کو گلے لگا لیا۔

خود ماڈ اٹھارہ سال کی تھی جب اس جانکاہ صدمے سے دوچار ہوئی۔ وہ کالج کے پہلے سال میں انگریزی اور فرانسیسی زبان کی تدریس کا کورس کر رہی تھی جب ان کا خاندان اس مصیبت کا شکار ہوا۔

باپ کی موت سے ایک ڈیڑھ سال قبل ہی شارلٹ کی طبیعت عجیب رہنے لگی تھی جسے اس کی ماں نے ''گھبراہٹ'' کا نام دیا تھا۔ بظاہر شارلٹ ایک ''حساس و نرم دل روح'' تھی جسے دیگر لوگ سمجھنے سے قاصر تھے۔ وہ تیس سال کی ہونے والی تھی اور ابھی تک غیر شادی شدہ تھی۔ اسی دوران جنگ کا آغاز ہو گیا۔ وہ جو پہلے سے ہی کمزور تھی، ذہنی طور پر مزید ابتر حال میں چلی گئی۔ اسے طرح طرح کے خوف لاحق ہو چکے تھے۔ وہ ایک تربیت یافتہ پیانسٹ تھی لیکن آج تک کسی عوامی جگہ پر اپنے فن کا مظاہرہ نہیں کر پائی تھی۔ اس کی جنونی حالت نے اسے اس قابل بھی نہیں چھوڑا تھا کہ وہ گھر پر کسی کو پیانو بجانا سکھا پاتی۔

جنگ کے دنوں میں ان کا بچا کھچا سرمایہ بھی تیزی سے خرچ ہو گیا۔ یہ ان بہنوں کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اپارٹمنٹ ان کی ذاتی ملکیت تھا ورنہ وہ کہاں کرایہ دیتی پھرتیں۔ اس کے باوجود بجلی، پانی اور گھر کو گرم رکھنے کے لیے خرچہ کرنا پڑتا تھا جو ان کے پاس بہت محدود رہ گیا تھا۔

ماڈ کو یاد تھا کہ سردیوں میں گھر میں وقت گزارنا کتنا

احمد بن حنبل علیہ الرحمۃ اللہ — تیسرا اور آخری حصہ

رضوانہ ساجد

علم کی طلب انسان کو سفر پر مجبور کرتی ہے اور علم کی پیاس تمام عمر محوِ سفر رکھتی ہے... یہی حال احمد بن حنبل کا بھی تھا جنہیں علم کی پیاس نے ہمیشہ بے چین رکھا اور قریہ قریہ کتنے ہی محترم اساتذہ سے ملاقات کا سبب بنتا چلا گیا۔

بستی بستی، نگری نگری علم کے ایک

شیدائی کی روداد

بعض محققین نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ خطوط مامون کے وزیر احمد بن داؤد نے تحریر کیے تھے جو مشہور معتزلہ تھا۔ اس پر اس لیے بھی یقین آجاتا ہے کہ مامون الرشید اس وقت بسترِ علالت پر تھا جس وقت یہ مکتوب تحریر کیے گئے۔ بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو، ان خطوط پر عباسی خلیفہ کے دستخط اور مہر ثبت تھی۔

اس حکم نامے کو پاتے ہی اسحٰق شیر ہوگیا۔ اس سے صرف یہ کہا گیا تھا کہ اگر یہ چاروں اپنے شرک سے باز نہ آئیں تو

انہیں رسیوں میں جکڑ کر میرے پاس بھیج دینا۔ اسحٰق ان سے مباحثہ کرسکتا تھا انہیں دلائل سے قائل کرسکتا تھا لیکن اس نے تشدد کا راستہ اختیار کیا۔ اس نے وہ کام خود انجام دینے کی ٹھان لی جو خلیفہ کو انجام دینا تھا۔

رات ہوئی تو پہلے سے منصوبے کے تحت اسحٰق نے ان اسیروں میں سے ایک سجادہ کو طلب کیا اور انہیں خلق قرآن کے عقیدے پر مجبور کرنے کے لیے سوال جواب کا سلسلہ شروع کیا۔ سجادہ نے وہی جوابات دیے جو وہ پہلے دے چکے تھے اور پھر صاف انکار کردیا۔ اب اسحٰق کے سامنے ایک ہی راستہ رہ گیا تھا۔ اس نے جلاد کو حکم دیا۔ سجادہ کی ننگی پیٹھ پر کوڑے برسنے لگے۔ زنداں کی سنگین دیواریں ان کی چیخوں سے گونجتی رہیں۔

جلاد کو حکم یہی تھا کہ جب تک وہ اسحٰق بن ابراہیم کی بات مان نہ لیں، ان کی چیخیں بلند سے بلند تر ہوتی رہیں۔

جب صبح کے آثار نمودار ہونے کو تھے اور سجادہ پر بے ہوشی طاری ہونے کو تھی، سجادہ نے اسحٰق کی بات مان لی۔

سجادہ کی بیڑیاں کاٹ دی گئیں۔ طبیب نے ان کے زخموں پر مرہم رکھا۔ اب وہ آزاد تھے۔

یہ دن کسی ہیبت ناک پرندے کی طرح اڑ گیا۔ رات ہوئی تو جلاد تشدد آزمانے کے لیے تیار تھا۔ اس مرتبہ اس قافلے کے ایک اور رکن "قواریری" کو طلب کیا گیا۔ کوڑے برسنے لگے۔ چیخیں بلند ہونے لگیں۔ قواریری کی ہمت نے جواب دے دیا اور انہوں نے بھی وہ بات مان لی جس کا مطالبہ کیا جارہا تھا۔ انہیں بھی سجادہ کی طرح رہا کردیا گیا۔

اب دو آدمی باقی رہ گئے۔ ایک امام احمدؒ دوسرے ابن نوحؒ۔

یہ حال دیکھ کر تیسری رات مجلس تشدد آراستہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اسحٰق سوچنے لگا کہ اگر یہ دو آدمی بھی تشدد کی تاب نہ لاکر تائب ہوگئے تو وہ خلیفہ کے پاس کسے لے کر جائے گا۔ اس نے تشدد کا ارادہ ترک کردیا اور صبح ہونے کے انتظار میں...... جاگتا رہا۔ صبح ہوتے ہی اس نے احمد بن حنبل اور ابن نوح کو رسیوں میں جکڑا اور سخت پہرے میں انہیں طرطوس کے لیے لے کر چلا جہاں خلیفہ مامون الرشید سکونت پذیر تھا۔

اب حال یہ تھا کہ اسحٰق کے سپاہی گھوڑوں پر سوار تھے اور ان دو ہستیوں کو پاپیادہ لے جایا جارہا تھا۔ وہ بھی اس عالم میں کہ ہاتھ رسیوں سے بندھے ہوئے تھے اور پیروں میں بیڑیاں تھیں۔ ان کی رفتار ذرا بھی کم ہوتی تو گھڑ سوار ان پر کوڑے برساتے۔

بغداد کی گلیاں احمد بن حنبل کی پاکیزگی کی قسمیں کھاتی تھیں۔ اہلِ بغداد جاں نثاری کے دعوے کرتے تھے لیکن شمشیر بکف سپاہیوں کے سامنے سب بے بس تھے۔ وہ صرف اتنا کرسکتے تھے کہ اپنے محبوب کی رخصتی کے لیے اپنے آنسو بہائیں یا اس کے ساتھ خلیفہ کے دربار تک جائیں۔ یہ ناممکن تھا اس لیے کہ اسحٰق نے اس ہجوم کو روکنے کے لیے مزید سپاہی بھیج دیے تھے۔

بغداد سے نکل کر اب یہ قافلہ صحرا میں داخل ہوچکا تھا۔ سورج بھی یہ ماجرا دیکھنے کے لیے سر پر آگیا تھا۔ پیاس سے قیدیوں کا برا حال تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان معزز قیدیوں کے منہ میں پانی کے چند قطرے ٹپکا دیے جاتے تھے۔

ابھی یہ قافلہ راستے میں تھا کہ ایوانِ اقتدار میں زلزلہ آگیا۔ مامون الرشید کا انتقال ہوگیا۔

ظالم ہٹ گیا تھا لیکن ظلم ختم نہیں ہوا تھا۔

مامون نے وفات سے قبل اپنے جانشین اپنے بھائی معتصم باللہ کو وصیت کی تھی۔

"خدائے بزرگ و برتر ایک ہے۔ نہ اس کا کوئی شریک ہے اور نہ اس کے سوا کوئی اور مدبر حکومت۔ وہ ہر چیز کا خالق ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ مخلوق ہے۔ قرآن بھی مخلوق ہونے سے مستثنیٰ نہیں اس لیے کہ وہ بھی دوسری چیزوں کی طرح ایک ایسی ہی چیز ہے اور ظاہر ہے خدا کی مثل کوئی چیز نہیں۔

اے ابواسحٰق! مجھ سے قریب ہوجا۔ جو کچھ تو دیکھ رہا ہے اس سے نصیحت حاصل کر۔"

قافلہ اسی طرح رواں دواں تھا کہ اچانک ابن نوح سختیوں کی تاب نہ لاکر چل بسے۔ ایک کو دیکھ کر دوسرے کی ہمت بڑھتی ہے لیکن اب احمد بن حنبل اکیلے تھے۔ قافلے والے اب بھی یہ سمجھ رہے تھے کہ ابن نوح کی شہادت سے خوفزدہ ہوکر احمد بن حنبل تائب ہوجائیں گے لیکن ہوا اس کے برعکس۔ امام احمدؒ کا عزم اور بھی پختہ ہوگیا۔ ابن نوح نے موت کو گلے سے لگالیا لیکن اپنے عقیدے سے منہ نہ پھیرا۔ "اے خدا! مجھے بھی اسی طرح استقامت عطا فرما۔"

موت کا خوف ان کے دل سے نکل گیا۔ اسحٰق نے دیکھا کہ ابن نوحؒ کو دفنانے کے بعد قافلہ آگے چلا تو امام احمدؒ کی چال میں جوانوں کی سی تیزی آگئی۔ اس نے جلادوں کو حکم دیا۔ "اس جوان پر بڑھاپا طاری کردو۔"

جلادوں نے مجلسِ ستم آراستہ کردی۔

وقت نے ثابت کیا ہے... ناحق بہنے والا لہو... لاکھ چھپائے... نہیں چھپتا بلکہ اپنے مجرم کو ایک نہ ایک دن ایسی اذیت میں مبتلا کردیتا ہے کہ اسے بے اختیار اپنا گناہ یاد آجاتا ہے... ایک ایسا ہی تماشا اس نے بھی دیکھا مگر زبان پر خاموشی کے تالے لگالیے کیونکہ... اس کی نظر میں جو بھی ہوا... درست ہوا۔

وقت کی وارننگ کے دام میں الجھے مجرموں کا انجام

وارننگ

اعتزاز سلیم وصلی

مجھے آج تک دو باتوں کی بالکل سمجھ نہیں آئی۔ ایک تو ڈربن سے اتنے فاصلے پر اس موٹیل کو خریدنے کی وجہ کیا تھی؟ مسز جے پال کے پاس شاید شوہر کے مرنے کے بعد اس کی چھوڑی گئی دولت کو ضائع کرنے کا کوئی اور طریقہ نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے یہ موٹیل خرید کر ان آوارہ کتوں کا جینا حرام کرنے کے ساتھ جو موٹیل میں آرام کرنے کے لیے ٹوٹے دروازے سے اندر داخل ہو جاتے تھے، دولت کو بھی ٹھکانے لگانے کا اچھا ذریعہ تلاش کرلیا تھا۔ شروع

شروع میں ان آوارہ کتوں نے ہمیں بہت تنگ کیا تھا مگر ان سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہم نے شہر سے زہر خرید کر رکھ لیا۔ یہ خاص قسم کا زہر تھا جس کا اثر جسم میں داخل ہونے کے تیس پینتیس منٹ بعد ظاہر ہوتا تھا۔ اس لیے ہمیں ان کتوں کی لاشیں ٹھکانے لگانے میں بھی کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ یہ خود ہی ہمارا پھینکا گیا گوشت کھاتے اور اپنی موت کا بندوبست کر کے نکل جاتے۔

این ٹو ہائی وے سے گزرنے والے وہ لوگ جو لمبے سفر کی وجہ سے بھی تھک کر راستے میں کچھ دیر رک کر آرام کی خواہش لیے کسی موٹیل کا رخ کرتے، کم از کم اس خواہش کی تکمیل کے لیے ہمارا موٹیل ہرگز نہ چنتے۔ وجہ تھی اس موٹیل کی عمارت...... جو بقول مسز جے پال تب تو بالکل نئی تھی جب ایک بار وہ اپنی دادی کے ساتھ یہاں تشریف لائی تھیں، اب موٹیل کی عمارت کی عمر کا اندازہ مسز جے پال کی عمر کے تناسب سے لگایا جا سکتا تھا۔

مجھے دو باتوں کی بالکل سمجھ نہیں آتی، دوسری بات کوئی نہیں تھی بلکہ خود مسز جے پال تھیں۔ بڑی عجیب طبیعت پائی تھی محترمہ نے۔ جے پال جب تک زندہ رہے وہ ہمیشہ مجھے کہتے۔

''میری بیوی کا دماغ پہلے بھی کم کام کرتا تھا مگر جب ستیش حادثے کا شکار ہوا، تب تو عقل بالکل ہی ختم ہوگئی۔''

ستیش ان کے اکلوتے بیٹے کا نام تھا جو ڈاکوؤں کے ایک گروپ کے ساتھ ڈکیتیاں کیا کرتا تھا۔ اسے دولت کی کمی نہ تھی پھر بھی اس کی بے چین طبیعت کو آرام نہ تھا۔ شاید وہ دنیا کا واحد ڈاکو تھا جو محض شوقیہ ڈکیتیاں کرتا تھا۔ ایسی ہی ایک ڈکیتی کے دوران پولیس کے ہاتھ لگا اور جوہانسبرگ کی ایک سڑک اس کے خون سے چند دن نم رہی۔ تب اس کی عمر صرف بیس سال تھی۔

مسز جے پال کے کئی دن آنسو خشک نہ ہوئے۔ ان لمحات میں مجھے ان کا بیٹا بننا تھا اور میں بن گیا۔ میں یعنی جوئے برگ جسے انہوں نے تب یتیم خانے سے لے کر پالا تھا جب شادی کے کئی سال گزر جانے کے بعد مسز جے پال کی گود خالی تھی۔ میری آمد کے چار پانچ سال بعد ہی ستیش کی آمد بھی ہوگئی۔ مسز جے پال مجھے کہتی تھیں۔

''تمہیں جب ہم گھر لائے تھے، خوش قسمتی ہمارے ساتھ آئی تھی۔'' اور میں ہمیشہ دل ہی دل میں اپنی بدقسمتی کو کوستا جو مجھے یہاں لے آئی تھی۔ مسٹر اور مسز جے پال کی محبت میں ستیش کی پیدائش کے بعد بھی کوئی فرق نہ آیا تھا۔ وہ مجھے سگی اولاد کی طرح چاہتے تھے مگر افسوس، ستیش نے کبھی مجھے اپنا بھائی نہ سمجھا۔ میں اس سے چھ سات سال بڑا تھا مگر اس نے ہمیشہ مجھے ذلیل کیا۔ میں اس سے جتنا پیار کرتا، وہ اتنا ہی میرے خلاف جاتا۔ ستیش کے ہوش سنبھالنے سے لے کر موت تک، کوئی ایک ایسا عمل بھی نہ تھا جس سے مجھے سکون ملا ہو۔ جو کمرا مجھے دیا جاتا، وہ اس پر قبضہ جما لیتا۔ میری کتابیں پھاڑ دیتا، میرا اسکول یونیفام اکثر مجھے صحن میں مٹی سے لتھڑا ملتا۔ میں اسے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا، بے شک ان میاں بیوی کو مجھ سے محبت تھی مگر ستیش کے مقابلے میں یہ محبت بہت کم تھی۔ اس لیے میں ان میاں بیوی کا دیا گیا سہارا گنوانا نہیں چاہتا تھا۔

''جوئے۔'' میرے خیالوں کا سلسلہ مسز جے پال کی آواز نے توڑ دیا۔

''یس مام!''

''باہر دیکھو بیٹا، کون آیا ہے۔'' مجھے لگا شاید انہیں غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ ابھی ابھی باہر بارش رکی تھی۔ خراب موسم میں کسی کے آنے کی امید نہیں تھی لیکن میں نے جب باہر نکل کر دیکھا تو مجھے گاڑی سے پولیس والے اترتے دکھائی دیے۔ دو آفیسرز اتر کر میری طرف آئے۔

''انویسٹی گیشن انچارج، جارج اسٹینلے اور میرے ساتھی رابرٹ۔'' ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کروایا۔ اس کی عمر تیس کے قریب تھی۔ اس کے سر کے آدھے بال اڑ چکے تھے جبکہ اس کا ساتھی رابرٹ جوان نظر آتا تھا۔

''جی، میں کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمیں خبر ملی ہے کہ اس موٹیل سے دس بارہ کلومیٹر دور ایک سنسان جگہ پر مسافروں کو لوٹا جا رہا ہے۔ کچھ مسافروں کو زخمی بھی کیا گیا ہے۔''

''ممکن ہے کیونکہ ہمارے موٹیل سے آگے کوئی خاص علاقہ نہیں، بس سنسان راستہ اور جنگلات ہیں۔'' میں نے سر ہلایا۔

''اس سلسلے میں ہمیں بھیجا گیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں، شہر سے لے کر آپ کے موٹیل تک جتنے بھی ہوٹل، ریسٹوران یا موٹیل آتے ہیں...... ان سب لوگوں کو وارننگ دیں اور انہیں محتاط رہنے کا مشورہ دیں۔ اس کے علاوہ اگر ممکن ہو تو انہیں رات کے سفر سے منع بھی کیا جائے۔'' مجھے اسٹینلے کی بات سن کر خوشی ہوئی۔ ڈاکوؤں کی مدد سے ہی سہی مگر ہمارے موٹیل میں گاہک آنے کی کوئی امید تو ہوئی تھی۔

''اس موٹیل میں کتنے لوگ موجود ہیں؟'' اس بار سوال رابرٹ نے کیا۔ اس کی آواز سن کر مجھے مایوسی ہوئی

پانچواں حصہ

پسِ پردہ

طاہر جاوید مغل

مختلف مزاج اور الگ الگ خاندانوں کا ملاپ اکثر و بیشتر مشکل ہو جاتا ہے چہ جائیکہ دو مختلف معاشروں میں رہنے والے لوگوں کا سنگم... جن میں زبان و بیان، رہن سہن اور مذہب جیسا فرق... جسے قبول کرنے کے لیے انسان کو دل بہت بڑا کرنا پڑتا ہے اور جناب دل کی بھی خوب رہی جب کسی پر آجائے تو سماج کی کوئی بھی دیوار ہو ثابت قدمی سے ڈٹ جانے والوں کے آگے ریت کی بھربھری دیوار بن کر گر بھی جاتی ہے مگر... یہاں مغربی ماحول میں گلابی جاڑوں کی طرح گلابی اردو بولنے والی اس دوشیزہ نے ایک پاکستانی نوجوان کو اس طرح فرینکفرٹ کی فضائوں کا اسیر کر ڈالا کہ پھر دنیا کے کسی گوشے میں اسے سکون نہ ملا... سکون ملتا بھی تو کیسے کہ وہ تو اپنوں کے پیار بھرے انتقام میں ایسے گِھرا ہوا تھا کہ اسے ذرا بھی کسی کی نیت پر شک نہ ہوا... لیکن محبت ہو یا نفرت لاکھ چھپائے نہیں چھپتی، پھر ان نفرتوں اور محبتوں کی حقیقت کیسے چھپی رہ سکتی تھی۔ لہٰذا پسِ پردہ ہونے والی سازشوں کا بالآخر ایک دن پردہ چاک ہوا اور چاہت کے مدھر جذبوں نے خود کو منوالیا۔

انجانی نفرتوں میں پناہ تلاش کرنے والے اس جوڑے کی کتھا جو...... اپنوں کے اصل روپ سے بے خبر تھا

فادر نے زویا کو سارہ جیم سے دور رہنے کا مشورہ دیا اور شامیر کے لیے بھی یہی حکم تھا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' زویا نے پژمردہ آواز میں کہا۔ اس کی بچی عینی اب جاگ گئی تھی اور تجسس سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ وہ شکل وصورت کے لحاظ سے بہت حد تک اپنی ماں پر گئی تھی۔ اپنے گال کا ننھا سا گڑھا بھی اس نے اپنی ماں سے ہی چرایا تھا۔

فادر جوناتھن نے وہ دروازہ لاک کردیا جہاں سے گزر کر سارہ جیم اس کمرے میں پہنچی تھی۔ وہ بولے۔ ''اگر سارہ یہ دروازہ کھٹکھٹائے بھی تو تم لوگوں نے نہیں کھولنا۔ کچھ دیر بعد وہ خود ہی چلی جائے گی۔ میں تم لوگوں کے لیے کھانے پینے کا انتظام کرتا ہوں۔''

اب دن کا اجالا پھیل چکا تھا۔ زویا اور شامیر کو اپنی یہ پناہ گاہ ہر طرح سے محفوظ لگ رہی تھی۔ یہ ایک کشادہ کمرا تھا جہاں قدیم طرز کا ڈبل بیڈ اور آبنوسی طرز کے نقش ونگار والے صوفے موجود تھے۔ کھڑکیاں طویل تھیں اور ان میں آہنی سلاخوں والی گریلیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ کمرا گرجے کی عمارت سے ذرا ہٹ کر تھا پھر بھی گرجے میں پڑھی جانے والی دعاؤں کی مدھم آواز اس کمرے تک پہنچ رہی تھی۔ یہ اتوار کا دن تھا اور گرجے میں گہما گہمی محسوس ہوتی تھی۔

کچھ دیر بعد ایک ملازمہ پرتکلف ناشتا لے کر آگئی۔ ناشتے کی ٹرے میں بچی کے لیے دودھ اور دلیا وغیرہ بھی موجود تھا۔ زویا کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ابھی تک تعاقب کرنے والوں کے خوف سے نکل نہیں سکی۔ اس کا خیال یہی تھا کہ وہ لوگ ابھی تک اسی قصبے میں موجود ہوں گے اور انہیں کھوج رہے ہوں گے۔

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے شومیر۔'' وہ منمنائی۔

''اللہ کا شکر ادا کرو زویا۔ اس نے ہمیں سخت ترین مرحلے سے بحفاظت نکال دیا ہے۔ آگے بھی اچھا ہی ہوگا۔ پلیز! تم چند نوالے لے لو۔''

وہ عجیب نظروں سے شامیر کو دیکھنے لگی۔ آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ بھی تو نہیں۔'' اس نے شامیر کے چہرے سے نظریں پھیریں اور اپنا دھیان بٹانے کے لیے بچی کو چوما۔

شامیر گہری سانس بھر کر بولا۔ ''زویا! میں جانتا ہوں، میں نے لیونا برگ جاکر اور تمہیں ڈھونڈ کر تمہاری مشکلوں میں بہت اضافہ کردیا ہے۔ میرے خیال میں اس کے لیے معذرت کے الفاظ کافی نہیں ہیں۔''

''جو ہونا تھا وہ ہوگیا شومیر! اب آگے کا سوچنا چاہیے۔ میرا خیال تو اب بھی یہی ہے کہ تم یہاں سے نکل کر جلد از جلد پاکستان چلے جاؤ۔ اس سلسلے میں فادر جوناتھن تمہاری بہت مدد کرسکتے ہیں۔''

''اور تمہیں یہاں ان مہلک حالات میں چھوڑ جاؤں؟ ہم جس طرح فلیٹ سے نکلے ہیں اور جس طرح تم نے نمرسی کے خاص کارندے کو گھائل کیا ہے...... یہ لوگ تمہیں آسانی سے معاف نہیں کریں گے...... اور میں سمجھتا ہوں زویا کہ یہ سب میرا ہی کیا دھرا ہے۔''

''پلیز شومیر! اس طرح مت سوچو۔ مجھے مزید تکلیف مت دو۔ میں کسی نہ کسی طرح اس صورت حال کو ہینڈل کرلوں گی۔''

''کس طرح کرو گی ہینڈل؟ پہلے صرف ایک بندہ تمہارا دشمن تھا، تمہارا شوہر رابرٹ۔ اب یہ نمرسی اپنے ٹولے سمیت تمہارے پیچھے ہے......''

''شومیر! میں نے کہا ہے نا کہ میں کسی نہ کسی طرح ہینڈل کرلوں گی۔ میرا پاسپورٹ اور دوسرے ضروری کاغذات میرے پاس آچکے ہیں۔ میں عینی سمیت جرمنی سے نکل جاؤں گی۔ بہت جلد نکل جاؤں گی۔'' اس نے تھوڑا توقف کیا اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''شومیر! تم نے دیکھ ہی لیا ہے کہ ہماری یہ مختصر سی دو ملاقاتیں بھی ہمارے لیے کتنی خطرناک ثابت ہوئی ہیں۔ کیوں نہ ہم عہد کریں کہ ایک دوسرے کو معاف کردیں گے۔ پھر کبھی نہیں ملیں گے۔ بس ایک دوسرے کو اپنی نیک دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔''

عینی دلچسپی سے شامیر کو دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ اس کی گود میں چڑھ آئی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی ہموار ڈاڑھی میں انگلیاں چلانے لگی۔ شامیر نے اسے گلے سے لگالیا۔ وہ ہوبہو زویا کی تصویر تھی۔ شامیر کو لگا کہ اس کے وجود سے زویا کی مہک ہی پھوٹ رہی ہے۔ اس نے اپنے ہونٹوں سے اس کے گال کے گڑھے کو چھوا۔ ایک معصوم مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

شامیر نے کھوئے کھوئے لہجے میں زویا کو مخاطب کرکے کہا۔ ''ایسا کیوں ہے زویا؟ جذبے سچے ہوتے ہیں پھر بھی محبتیں پروان کیوں نہیں چڑھتیں؟ کیوں محبت کرنے والوں کو آخر میں ایسے ہی گھسے پٹے فقرے دہرانے پڑتے ہیں...... ہم ایک دوسرے کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔ ہم ایک دوسرے کو معاف کردیں گے، وغیرہ وغیرہ۔ ہم کیوں سچ کا سامنا نہیں کرپاتے؟''

''تم کس سچ کی بات کررہے ہو؟'' زویا کے لہجے میں